ماہنامہ

حِلّيَّة

فیصل آباد پاکستان

شوال المکرم ۱۴۳۰ھ بمطابق ستمبر و اکتوبر 2009ء

عدمِ تشدّد کی راہ ہی بہتر ہے — ابن انیس حبیب الرحمٰن لدھیانوی

مکاتیب رئیس الاحرارؒ سے

غلام رسول مہر مرحوم اور رئیس الاحرارؒ میں اہم خط و کتابت

رمضان المبارک کے بعد ہم کو کیا کرنا چاہیے!

زیر ادارت

ابنِ انیس مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانویؒ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ماہنامہ ملیہ فیصل آباد پاکستان

ہر اسلامی مہینے کے شروع میں شائع ہوتا ہے۔

شوال المکرم ۱۴۳۰ھ جلد نمبر 5

بمطابق

ستمبر، اکتوبر 2009ء شمارہ نمبر 10

فہرست مضامین

بیاد

حضرت مولانا انیس الرحمٰن لدھیانوی
خلیفہ مجاز حضرت شاہ عبدالقادر رائپوری

بفیض

حضرت سید نفیس الحسینی
رحمۃ اللہ علیہ

مدیر اعلیٰ و سرپرست

ابن انیس مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی

مدیر
حماد الرحمٰن لدھیانوی

نائب مدیر
جواد العزیز لدھیانوی

فی شمارہ 20 روپے — پاکستان میں سالانہ 200 روپے
سالانہ بدل اشتراک بیرون ملک 40 امریکی ڈالر

رابطہ کے لیے

ماہنامہ ملیہ — جامعہ ملیہ اسلامیہ

محلہ خالصہ کالج P.O مدینہ ٹاؤن، فیصل آباد
041-8711569
0321-6611910

ناشر...... حبیب الرحمٰن لدھیانوی — مطبع: ظفر اینڈ فضل پرنٹنگ پریس فیصل آباد

Decl No. 3483-85

کلمۃ الحبیب (پہلا حصہ)

عدم تشدد کی راہ ہی بہتر ہے

مفتی حبیب الرحمن لدھیانوی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمدللہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفی

گزشتہ چند ماہ سے ''ماہنامہ طیبہ'' کے شمارے کے عنوان ''کلمۃ الحبیب'' میں ملکی اور بین الاقوامی حالات پر راقم کی تحریرات پر قارئین نے پسندیدگی کا اظہار کیا۔ خطوط، ای میل اور ٹیلیفون کے ذریعہ ان تجزیوں کی تعریف کی۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ ان حضرات کی طرف سے اس بات پر اصرار کیا جارہا ہے کہ تجزیہ تو خوب ہوتا ہے مگر اس کا حل نہیں بتایا جاتا۔ ہمارے محترم قارئین کا ہم پر اس بات کا شدید دباؤ ہے کہ اس کا حل بھی بتائیں۔

مجھ جیسا ناکارہ اور درماندہ آدمی کیا حل بتاسکتا ہے، اس پر تو بڑے بڑے جغادری قسم کے ماہرین بھی کچھ نہ کرسکے۔ دوسری بات یہ کہ اگر کچھ حل بتایا جائے تو اس پر عمل کون کرتا ہے۔ یا اگر کوئی عمل کرنا چاہے تو اس کو کرنے کون دیتا ہے۔ ہر ایک کا علیحدہ مزاج ہے، علیحدہ ذوق ہے۔ اگر کسی کے مزاج کے خلاف بات ہوجائے تو وہ یا تو دہشت گرد یا دہشت گردوں کا حامی قرار دیا جاتا ہے۔ یا دوسری طرف کے لوگ مرنے مارنے پر آجاتے ہیں۔ مگر اس کے باوجود ہم اپنے ناقص فہم کے مطابق لوگوں کے اصرار پر کچھ گذارشات پیش کردیتے ہیں۔ یہ گذارشات اگرچہ مسائل کا حل نہیں مگر ان کے ذریعہ کوئی راستہ ضرور نکالا جاسکتا ہے۔ اس معاملے میں تاریخ اسلام اور تحریکات اسلام میں سے اسلاف کے کچھ طرز عمل کو سامنے رکھ کر کچھ عرض کیا جائے گا۔

اس وقت دنیا ایک جنگل کی مانند ہے جس میں شکاری ہاتھ میں بندوق لیئے شکار کھیل رہا ہے۔ لازمی بات ہے کہ جب شکار کے پاس اپنے دفاع کی طاقت نہ ہوگی تو یا پھر وہ مارا جاتا ہے یا پھر وہ کسی غار یا اوٹ میں پناہ لینے پر مجبور ہوگا۔ دوسری بات یہ ہے کہ جنگل کے کچھ جانور بھی اس وقت شکاری کا ساتھ دے رہے ہیں، صرف اس لیئے کہ شاید شکاری ان پر رحم کردے۔ حالانکہ شکاری باقی شکاروں کو ذبح کرکے پھر ان مخبر اور معاون شکاروں کے خبر لے گا۔

اب ہم دوسری طرف آتے ہیں کہ ہمیں اس وقت کرنا کیا ہے؟۔ پہلی بات یہ کہ ہم مسلمان ہیں اور جو کچھ بھی ہو رہا ہے وہ مسلمانوں کے خلاف ہو رہا ہے۔ مسلمان ہی ذبح ہو رہے ہیں۔ اس پر سب سے پہلے ہمیں جناب رسول اکرم ﷺ کے فرمان کو آگے رکھنا ہے فرمایا کہ ''مسلمان جب کسی بُرائی کو دیکھے تو اُسے ہاتھ سے روکے، اگر ہاتھ سے روکنے کی طاقت نہ ہو تو زبان سے روکے، اور اگر زبان سے بھی روکنے کی طاقت نہ ہو تو اس برائی کو دل میں بُرا جانے، اور فرمایا کہ یہ ایمان کی سب سے کمزور علامت ہے''۔

علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ ہاتھ سے روکنے سے مراد حاکم وقت ہے۔ زبان سے روکنا علماء کا کام ہے، اور اس پر عمل کرتے ہوئے اس کو بُرا جاننا عوام کی ذمہ داری ہے۔

ہم ہندوستان کی تحریک آزادی پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمارے سامنے یہ بات آتی ہے کہ اس میں سب سے زیادہ کردار علماء کرام کا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سب سے زیادہ مظالم بھی علماء پر توڑے گئے۔ علماء کرام نے حالات اور وقت کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے فیصلے کیے۔

ہندوستان میں انگریز کی عملداری ۱۷۵۷ء میں شروع ہوئی جب اس نے پلاسی کی جنگ میں نواب سراج الدولہ کو شکست دی۔ اور پھر آہستہ آہستہ پورے ہندوستان پر عملاً قابض ہو گیا۔ اور مسلمان بادشاہ انگریز کے وظیفہ خوار ہو کر رہ گئے۔ اس میں میر جعفروں اور میر صادقوں کا کردار سب سے زیادہ ہے۔ اس بات کا سب سے زیادہ رنج علماء کو ہوا۔ چنانچہ سب سے پہلے حریت پسند علماء نے ہندوستان کی شرعی حیثیت کا تعین کیا۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے فرزند حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے ۱۸۰۳ء میں ہندوستان کے دارالحرب ہونے کا فتویٰ دیا۔ اس وقت جہاد کی شکل نہ تھی بحرف اتنا ہی کیا جا سکتا تھا۔ چنانچہ صاحب بصیرت علماء نے اس کو غنیمت سمجھ کر اپنی تیاری شروع کی اور حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ نے عملی جہاد کی بنیاد ڈالی۔ مگر اس وقت حکمت عملی کی بنیاد پر جہاد کے لیے اذن عام نہیں کیا۔ اور نہ ہی فرضیت جہاد کا عام فتویٰ دیا گیا۔ ۱۸۳۱ء میں بالاکوٹ سے جہاد کا اعلان کر دیا۔ حضرت سید احمد شہیدؒ اپنے علاقہ رائے بریلی (یو۔پی) سے بھی جہاد کا اعلان کر سکتے تھے مگر انہوں جنگی حکمت عملی سے کام لیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کو اپنے علاقے سے افرادی قوت میسر نہیں ہو سکتی تھی، دوسری یہ کہ ان کا علاقہ ہندوستان کے وسط میں تھا۔ جنگی نقطہ نگاہ سے جنگ ایسے علاقے سے لڑی جاتی ہے جو کہ سرحد پر واقع ہو تا کہ پسپا ہونے کی صورت میں دوسرے علاقے میں پناہ لی جا سکے۔ صوبہ سرحد کا علاقہ اس لیے منتخب کیا کہ وہ ہندوستان کی سرحد پر واقع

بھریں۔ دوسرے یہ کہ انگریز کی فوج کا ایک حصہ ان دنوں بمبئی کے راستے چین جارہا تھا۔ اس کی مدد انگریز کے کام آ گئی۔ جس کے نتیجہ میں جنگ آزادی ناکام ہوگئی۔ اس جنگ میں مسلمانوں کے ساتھ اگرچہ کچھ ہندو بھی شامل تھے مگر وہ بحیثیت قوم اس جنگ میں شامل نہ تھے۔ چنانچہ انگریز کا سارا عتاب مسلمان قوم پر ہی گرا۔ خصوصاً مسلمان علماء اس کے ہدف تھے۔ چنانچہ علماء کو دہلی کے لال قلعہ میں پھانسیاں دی گئیں۔ کالا پانی کی سزا دی گئی۔ جائیدادیں چھین لی گئیں۔ ظلم کے پہاڑ توڑے گئے۔ کئی علماء نے مصلحتاً وقتی طور پر روپوشی اختیار کر لی۔ ۱۸۶۱ء میں جب انگریز کی طرف سے عام معافی کا اعلان کیا گیا تو یہ حضرات منظر عام پر آ گئے۔

یہاں سے آگے دیکھنا یہ ہے کہ اس کے بعد جنگ آزادی میں شریک لوگوں نے طرز عمل کیا اختیار کیا۔ جو لوگ انگریز کے خلاف برسر پیکار تھے ان لوگوں نے ہمت نہیں ہاری۔ البتہ طریقہ کار تبدیل کر لیا۔ وہ طریقہ کار "عدم تشدد پر مبنی سیاست" کا تھا۔ ان حضرات نے مساجد، مدارس، اور خانقاہوں کو آباد کرنے کا منصوبہ بنایا۔ اور اس پر کام شروع کر دیا۔ اگرچہ ۱۸۵۷ء سے پہلے بھی یہ چیزیں موجود تھیں مگر ان میں ترتیب و تنظیم نہیں تھی۔ ہر صاحب علم اور صاحب فن اپنے طور پر کچھ انتظام کر لیتا مگر مدارس کی شکل میں منظم نہیں تھا۔ ۱۸۶۱ء میں پنجاب کے شہر لدھیانہ میں حضرت مولانا عبدالقادر لدھیانوی کے فرزندوں مولانا محمدؒ، مولانا عبدالعزیزؒ، مولانا عبداللہؒ نے مدرسہ اللہ والا قائم کیا۔ ادھر ۱۸۶۷ء میں ضلع سہارنپور کی ایک بستی دیوبند میں انار کے ایک درخت کے نیچے ایک مدرسہ کی بنیاد رکھی گئی۔ اسی سال سہارنپور شہر میں مظاہر العلوم کے نام سے ایک مدرسہ کھولا گیا۔ اسی طرح خانقاہوں میں "حق ھو" کی آوازیں گونجنے لگیں۔ اس کے ساتھ ساتھ تحریک آزادی کو جاری رکھا گیا مگر عدم تشدد کا راستہ اختیار کیا گیا۔ چونکہ یہ لوگ عدم تشدد پر کام کر رہے تھے اس لیئے انگریز ان کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھا سکتا تھا۔ البتہ انگریز نے اس تحریک کو ناکام کرنے کے لیئے اپنی طرف سے بھی ایسے ہی محاذ کھولے۔ مدارس کے مقابلے میں سرسید احمد خان کے ذریعہ علی گڑھ یونیورسٹی کھولی۔ تاکہ اس یونیورسٹی کے ذریعہ انگریز کے غلام پیدا کیئے جائیں۔ چنانچہ اسلام کے تمام طے شدہ اصولوں کو متنازع بنا دیئے گئے۔ سرسید احمد خان نے نیچری مسلک ایجاد کیا جس معطلب یہ تھا دین کو اپنی عقل کے مطابق سمجھو۔ سرسید نے اپنی عقل کے مطابق وحی، فرشتوں، جنت دوزخ، خانہ کعبہ کا قبلہ ہونا اور معراج کا انکار کر دیا۔ فکری آزادی کے نام پر مختلف گروہ پیدا کیئے، جو کہ اسلام کے متفق اصولوں کو متنازع بنانے پر سارا زور لگاتے۔ اسی طرح فقہی معاملات میں بدعات کو جگہ دی گئی۔ قبا پوشی کے پردے میں عیاشی کے

ریا لوگوں کی خانقاہیں بنائی گئیں، تاکہ لوگ ان خانقاہوں سے متنفر ہو جائیں۔ ترکِ تقلید کے پردے میں انکارِ حدیث اور اصرارِ حدیث کے فتنے پیدا کیے۔ یہاں تک کہ انگریز نے ایک نبی بھی پیدا کر دیا، تاکہ اسلام کی بنیاد ''عقیدہ ختم نبوۃ'' کو ختم کر دیا جائے۔ نیز اس جعلی نبوت کے ذریعہ اسلام کے شعائر مثلاً جہاد وغیرہ کو منسوخ کر دیا۔ اور اس پر انگریز کی سرپرستی میں عمل بھی شروع کیا گیا۔

۱۸۸۰ء کے بعد انگریز نے ہندوستان میں کچھ ایسی اصلاحات کیں جن کی وجہ سے لوگوں کو سیاسی سرگرمیاں شروع کرنے کی اجازت دے دی گئی۔ جس کے نتیجے میں ۱۸۸۵ء میں ''انڈین نیشنل کانگریس'' کا وجود عمل میں آیا۔ یہ تنظیم ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ تنظیم تھی۔ اس تنظیم کا بنیادی نقطہ یہ تھا کہ بحث انہی امور میں کی جائے جو کہ مشترک ہوں۔ اختلافی امور کو نہ چھیڑا جائے۔ یہ ایک ایسی تنظیم تھی جس کی وجہ سے ہندوستان کے لوگوں کو کچھ آسانی میسر آ سکتی تھی۔ چنانچہ اس میں مسلمان کثیر تعداد میں شریک ہونا شروع ہو گئے۔ مسلمانوں کی یہ دلچسپی دیکھ کر انگریز اور اس کے زلہ خوار اس تنظیم میں مسلمانوں کی شرکت کے خلاف ہو گئے۔ جس میں سر سید احمد خان پیش پیش تھے۔ انہوں نے اعلان کر دیا کہ کانگریس میں شامل ہونا ناجائز ہے اور اس کے مقابلے میں محمڈن نامی ایک ایسوسی ایشن بنائی۔ یہ وہ دور تھا کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں شرکت کرنے والے اور فرضیت جہاد کا فتویٰ دینے والے یا تو دنیا سے کوچ کر گئے تھے یا وہ ہندوستان سے ہجرت کر گئے تھے۔ ان حالات میں کسی ایسی مدبر مفتی کی ضرورت تھی جو کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں نہ صرف شریک ہو چکا ہو بلکہ اس وقت کے فتویٰ فرضیت جہاد کے دینے میں شریک رہا ہو۔ وہی اس وقت کے حالات کی تشخیص کر کے فتویٰ جاری کرے۔ کانگریس کے دو مسلمان رکن ''طیب جی، محمد علی بھیم جی'' بمبئی سے اس کے لیے باقاعدہ سفر کر کے لدھیانہ (پنجاب) میں آئے۔ کیونکہ ان کو معلوم ہو گیا تھا کہ ۱۸۵۷ء کی یادگاریں ابھی زندہ ہیں اور لدھیانہ میں مقیم ہیں۔ ان لوگوں نے آ کر یہ استفتاء کیا کہ ''مسلمانوں کو کانگریس میں شامل ہونا چاہیے یا نہیں؟'' چنانچہ علماء لدھیانہ نے مسلمانوں کے لیے کانگریس میں شامل ہونے کے جواز کا فتویٰ دیا۔ علماء لدھیانہ کا یہ فتویٰ ایک سیاسی حکمت عملی تھی۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستان کے عوام خصوصاً مسلمان کسی نہ کسی طرح سے قومی دھارے میں شریک ہو جائیں۔ سر سید احمد خان کی پارٹی نے اس وقت ایک شرارت یہ کی کہ ایک استفتاء اس عبارت میں کہ ''کچھ مولویوں نے ہندوؤں کے ساتھ تعلقات بنانے کو جائز اور مسلمانوں کے ساتھ تعلقات نہ رکھنے کا فتویٰ دیا ہے۔ اس کے متعلق کیا رائے ہے؟'' حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے پاس بھیجا کہ حضرت گنگوہیؒ نے جواب میں لکھا کہ ایسا فتویٰ

دینے والے لوگ فاسق ہیں۔ سر سید اور اس کی پارٹی نے حضرت گنگوہیؒ کا یہ فتویٰ مشتہر کر دیا۔ جس پر علماء لدھیانہ نے حضرت گنگوہیؒ سے رابطہ کیا۔ جب حضرت گنگوہیؒ کو معلوم ہوا کہ کانگریس میں شمولیت کے جواز کا یہ فتویٰ علماء لدھیانہ کی طرف سے ہے تو اس پر حضرت گنگوہیؒ نے نہ صرف اس فتوے کو واپس لیا بلکہ علماء لدھیانہ سے تحریری معذرت بھی کی۔ یہ معذرت نامہ ہمارے پاس محفوظ ہے۔ اور بعد میں اس فتوے پر علماء دیوبند میں سے حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ علماء بریلی کے سرخیل حضرت مولانا احمد رضا خان بریلوی سمیت تقریباً پانچ سو علماء نے تصدیقی دستخط کیے۔

بیسویں صدی عیسوی کے شروع میں بھی اندرون خانہ عدم تشدد کی بنیاد پر انگریزی حکومت کے خلاف تحریکوں میں کچھ تیزی آ گئی۔ جس میں شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن دیوبندیؒ کی تحریک ریشمی رومال سرفہرست ہے۔ مگر اس میں اپنوں کی مخبری نے کام دکھایا اور یہ تحریک ناکام ہو گئی۔ حضرت شیخ الہندؒ نے پھر بھی ہار نہیں مانی اور عدم تشدد کا راستہ اختیار کرتے ہوئے ۱۹۱۹ء میں جمعیۃ علماء ہند کی بنیاد رکھ دی۔ اس کا مقصد صرف یہ تھا کہ چونکہ مسلمانوں کی باقاعدہ کوئی ایسی تنظیم نہ تھی جس کی وجہ سے مسلمانوں کی الگ شناخت ہو سکے۔ کانگریس میں ہندو اور مسلمان دونوں شریک تھے مگر اس میں ہندوؤں کی اکثریت کی وجہ سے مخالفین اس کو ہندوؤں کی جماعت کہتے تھے۔ دوسری طرف مسلم لیگ تھی جو کہ مسلمانوں کی نمائندہ ہونے کی دعوے دار تھی جبکہ حقیقت میں وہ انگریز کی نمائندہ تھی۔ اس میں خود بینوں، خود فروشوں، اور کج کلاہوں کی بھرمار تھی۔ وہ مسلم اقلیت کا نام استعمال کر کے اپنے مفادات اٹھاتے اور انگریز کے پاؤں مضبوط کرنے میں لگے رہتے۔ ان باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے جمعیۃ علماء ہند کی بنیاد رکھی گئی۔ اس کا مقصد بھی عدم تشدد کے پرچار کے ساتھ ساتھ ہندوستان کی آزادی تھا۔

۱۹۲۹ء میں لاہور میں "مجلس احرار اسلام ہند" کے نام سے مسلمانوں کی ایک جماعت قائم کی گئی۔ اس جماعت کی بنیاد انگریز کی مخالفت پر ہی نہیں بلکہ انگریز دشمنی پر تھی۔ اس جماعت میں ایک سے بڑھ کر ایک خطیب موجود تھا۔ رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمن لدھیانویؒ، امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ، مولانا داؤد غزنویؒ، مولانا مظہر علی اظہر وغیرہ ایسے بلند خطیب تھے کہ ان لوگوں کی تقریروں نے ہندوستان کے مسلمانوں میں آگ لگا دی۔ جمعیۃ علماء ہند اور مجلس احرار اسلام کے قیام کا بنیادی مقصد ہندوستان کی مکمل آزادی تھا۔ جبکہ دوسری سیاسی جماعتوں بشمول "انڈین نیشنل کانگریس اور مسلم لیگ" دونوں کا ایجنڈا مکمل آزادی نہیں تھا۔ اس لیے جمعیۃ علماء اور مجلس احرار کو بہت جلد عوامی مقبولیت حاصل ہوئی۔ ان دونوں جماعتوں نے انگریز دشمنی کے باوجود عدم تشدد کی پالیسی اپنائی۔ یہ

لوگ اسلام کے نام پر مسلم لیگ کی طرح انگریز کے دروازوں پر چکر نہیں لگاتے تھے بلکہ ان لوگوں نے جیلوں کو اپنے تحریکوں سے بھر دیا۔ ان لوگوں نے ماریں ضرور کھائیں جیلوں میں گلے سڑے، تشدد برداشت کیا مگر تشدد اور مسلح ٹکراؤ کی پالیسی نہیں اپنائی۔ مجلس احرار اسلام نے رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کی زیر قیادت ۱۹۳۱ء میں کشمیر کے مظلوم مسلمانوں کے حقوق کے لیے تحریک کشمیر چلائی نیز یہ تحریک قادیانیت کے رد میں بھی تھی۔ اس تحریک میں مجلس احرار نے چالیس ہزار سے زیادہ رضاکار جیلوں میں بھیجے۔ یہ ایک ایسا تاریخی ریکارڈ ہے کہ ہندوستان میں کسی بھی تحریک میں اتنی کثیر تعداد میں لوگ کبھی بھی گرفتار نہیں ہوئے۔ کانگریس جیسی عوامی جماعت بھی اتنی بڑی تعداد میں کسی تحریک میں اپنے رضاکار گرفتار نہ کرا سکی۔ مجلس احرار اسلام کی اس تحریک میں جمعیۃ علماء ہند کا تعاون بھی شامل تھا۔ اتنی بھرپور تحریک کے باوجود ان حضرات نے عدم تشدد کا دامن نہیں چھوڑا۔ ان لوگوں نے جیلوں کو آباد کیا، ماریں کھائیں، ان کو ہتھکڑیاں اور بیڑیاں ڈالی گئیں مگر ان لوگوں نے تشدد کا راستہ اختیار نہیں کیا۔ ورنہ یہ حضرات اگر تشدد کا راستہ اختیار کرتے تو نہ جانے کتنا خون بہتا۔

انگریز اور اس کے مسلمان زلہ خواروں کو جب مجلس احرار اسلام کی اس تحریک سے زبردست پذیرائی کا علم ہوا تو انہوں نے مجلس احرار اسلام کو تباہ کرنے کے لیے مسجد شہید گنج لاہور کا شوشہ کھڑا کر دیا۔ اس بات کا سب کو علم تھا کہ مسجد شہید گنج کی جگہ عدالتیں کئی دفعہ مسلمانوں کی درخواست کے باوجود سکھوں کے حق میں فیصلہ دے چکی ہیں۔ مگر پھر بھی اس فتنہ کو کھڑا کرنے کا مقصد مجلس احرار کو جال میں پھنسا کر اسے تباہ کرنا تھا۔ گورنمنٹ اور مسلم لیگیوں کی کوشش تھی کہ مجلس احرار تشدد پر اتر آئے۔ اس پر مجلس احرار کے زعماء کو اکسایا بھی گیا۔ مگر مجلس احرار کی قیادت زیرک لوگوں پر مشتمل تھی۔ ان کو معلوم تھا کہ یہ مسجد کسی بھی متشددانہ تحریک سے حاصل نہیں ہوگی۔ اور حالات یہ بتا رہے تھے کہ اگر مجلس احرار اس تحریک میں نہیں آتی تو تباہ ہو جائے گی۔ جبکہ تحریک میں شامل ہونے کی وجہ سے کثیر تعداد میں مسلمان مارے جائیں گے اور مسلمانوں کی ہلاکت کا سارا ملبہ مجلس احرار پر ڈال دیا جائے گا۔ چنانچہ مجلس احرار کے زعماء نے سوچا کہ ہم تحریک میں متشددانہ کردار ادا کرتے ہیں یا نہیں کرتے دونوں صورتوں میں تباہی ہمارے دھانے پر کھڑی ہے۔ اور دوسری طرف ہمارے تحریک میں آنے کی وجہ سے بے گناہ مسلمان مارے جائیں گے۔ اس لیے انہوں نے عدم تشدد کا راستہ اختیار کیا مگر بے گناہ مسلمانوں کا خون بہانے میں شامل نہیں ہوئے۔ اور دوسری طرف انگریز کے ایماء پر کچھ لوگوں نے اس وقت کے نادان مسلمانوں کو بھڑکا کر آگے کیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان مسلمانوں پر گولی چلائی گئی۔ اور سینکڑوں مسلمان

مارے گئے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جو لوگ مسجد شہید گنج لینے کے چکر میں سینکڑوں مسلمانوں کا خون بہا چکے مگر آج بھی ان لوگوں کے ملک پاکستان میں مسجد شہید گنج سکھوں کے قبضہ میں ہے۔

نیز مختلف موقعوں پر مجلس احرار اور جمعیۃ علماء ہند نے مسلمانوں کی بقاء اور ان کے حقوق کے لیے بانی پاکستان مسٹر محمد علی جناح اور ان کی جماعت مسلم لیگ سے کئی دفعہ تعاون کے لیے ہاتھ بڑھایا ،معاہدے بھی کیے مگر مسلم لیگ کے زعماء نے اس تعاون اور معاہدوں کو یکسر پس پشت ڈال دیا۔ اس کی وجہ صرف اور صرف یہ تھی مجلس احرار اور جمعیۃ علماء ہند تحریک آزادیٔ ہند کا ہراول دستہ تھیں جبکہ مسلم لیگ تحریک غلامی کے ہراول دستے کا کام سرانجام دے رہی تھی۔

میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ مجلس احرار اسلام یا جمعیۃ علماء ہند نے بھرپور تحریکیں چلانے اور جیلیں کاٹنے، لاٹھیاں کھانے، تشدد برداشت کرنے کے باوجود عدم تشدد کی پالیسی کو ترک نہیں کیا۔

قصہ مختصر یہ کہ انگریز انہی لوگوں کی قربانیوں کی وجہ سے ہندوستان چھوڑ کر چلا گیا۔ جاتے ہوئے برصغیر کو تقسیم کر گیا۔ ہندوستان میں تو انہی لوگوں کو حکومت دی جنہوں نے تحریک آزادی میں حصہ لیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ہندوستان میں ہندوؤں کی اکثریت تھی ’’الکفر ملۃ واحدۃ‘‘ کے مصداق انگریز کو ہندو سے خطرہ نہیں تھا اس لیے نہ صرف ان کو مکمل آزادی دی بلکہ ان کی ہر کام میں مدد بھی کی۔ جبکہ انگریز نے جاتے ہوئے پاکستان کی باگ ڈور اس طبقے کی حوالے کی جن کا تحریک آزادی برصغیر میں کوئی حصہ نہ تھا۔ ان لوگوں نے ہمیشہ انگریز سے ہی وفاداری کی۔ یہ بات ذہن میں رہے کہ مسلم لیگ نے آزادی کی جنگ نہیں لڑی ،انہوں نے اپنے مفادات کو ہی مدنظر رکھا۔ اسی لیے انہوں نے آزادی نہیں بلکہ تقسیم کی جنگ لڑی۔

دنیا میں دستور یہ ہے کہ جب کہیں آزادی کی جنگ لڑی جاتی ہے تو آزادی کے بعد سب سے پہلا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ لوگ جو کہ آزادی کی تحریک میں رکاوٹ ہوتے ہیں ان کو غدار قرار دیکر سزائیں دی جاتی ہیں۔ اور پہلے سے قائم نظام کو ختم کر کے اپنا نیا نظام لایا جاتا ہے۔ جس کے لیے لوگوں نے قربانی دی ہوتی ہے۔ مگر ہمارے ہاں یہ ہوا کہ جن لوگوں نے آزادی کی خاطر اپنی ساری زندگی تج دی، آزادی کے بعد ان پر وہی لوگ اور نظام مسلط کیا گیا جس کے خلاف قربانیاں دی گئی تھیں۔ ہمارے ملک کے حکمران وہ لوگ بنائے گئے جنہوں نے انگریز کی چاپلوسی کا ریکارڈ قائم کیا تھا۔ ہمارے کمشنر اور ڈپٹی کمشنر وہ لوگ بنائے گئے انگریز دور میں جن کے حکم پر آزادی کے متوالوں کو جیلوں میں ڈالا جاتا تھا۔ ہمارے ایس۔ پی اور ڈی۔ ایس۔ پی وہی تھے جنہوں نے آزادی کے متوالوں پر گولیا

چلائیں۔ ہمارے ہاں قانون وہی نافذ کیا گیا جس کو توڑ کر لوگ جیلوں میں جاتے تھے۔ غرضیکہ ہر وہ چیز یہاں قائم کی گئی جس کے خلاف آزادی کے متوالوں نے آواز اٹھائی۔ یہاں تک کہ انہیں لوگوں کو یہاں حکمرانی دی گئی جن کو یہاں کا مسلمان، مسلمان نہیں سمجھتا تھا۔ یعنی قادیانیوں کو کلیدی آسامیوں پر بٹھایا گیا۔ جبکہ انہی کو علامہ اقبال نہ صرف دائرہ اسلام سے خارج سمجھتے تھے بلکہ انہوں نے ان کو واجب القتل تک قرار دیا تھا۔ یہ بات ذہن میں رہے کہ انگریز سے آزادی کے متوالوں کی مخالفت اس کی سفید چمڑی کی وجہ سے نہیں تھی اور نہ ہی اس کی نیلگوں آنکھوں کی وجہ سے تھی۔ بلکہ اس کے کلچر اور قانون کی وجہ سے تھی۔ مگر ہم نے اسی چیز کو نہ صرف باقی رکھا بلکہ اس کو نافذ کرنے کے لیے ہلاکتوں کے پہاڑ کھڑے کر دیئے۔

تقسیم ہند کے بعد پاکستان میں سب سے پہلی جو عوامی تحریک چلی وہ ۱۹۵۳ء میں قادیانیوں کو اقلیت قرار دینے کے لیے تھی۔ مسلمانوں نے یہ سمجھا کہ اب مسلمانوں کی آزاد مملکت قائم ہو چکی ہے اس لیے ہمارا حق ہے کہ ہر ایک کے مذہب کا تعین کر کے اس کے حق کے مطابق انہیں نوازا جائے۔ مگر قادیانی مسلمان نہ ہونے کے باوجود پاکستان کی کلیدی آسامیوں پر براجمان ہو گئے۔ اس پر تحریک چلی ہمارے علماء کی کوشش تھی کہ اس میں تشدد نہ آئے مگر اس میں ایسے لوگ بھی آگئے جو اس کو تشدد کی طرف لے گئے۔ قادیانی یہی چاہتے تھے۔ چنانچہ اس مسلمان مملکت میں نہتے مسلمانوں پر اسلام ہی کے نفاذ کے مطالبے پر لوگوں پر تشدد کیا گیا، گولیاں چلائی گئیں۔ تاریخ بتاتی ہے جس وقت نہتے مسلمانوں پر گولیاں چلائی جاری تھیں تو ختم نبوت کے پروانے اپنا سینہ کھول کر فوج کے آگے کھڑے ہو جاتے تھے اس پر ہماری پاک فوج ان کے سینوں سے گولیاں پار کر دیتی تھی۔ گولی چلانے کا یہ حکم کوئی انگریز نہیں دیتا تھا بلکہ مسلمان نام کے حاکم تھے۔ جن لوگوں نے مسلمانوں کے لیے ایک آزاد مملکت حاصل کی تھی وہی نہتے راسخ العقیدہ مسلمانوں پر گولیاں چلانے کا حکم دیتے تھے۔ اصل میں علی گڑھ یونیورسٹی کے ذریعہ انگریز نے اپنے سدھائے ہوئے اس ملک پر مسلط کیے تھے۔ ان سدھاؤں نے انگریز کے کھلائے ہوئے راتب کو حلال کرنا ضروری سمجھا تھا۔ انگریز نے اس ملک کی باگ ڈور بدعہد بدعقیدہ، بددین اور بددیانت لوگوں کے ہاتھ میں دی تھی۔

قصہ مختصر کہ پھر بھی ہمارے بڑوں نے حکومت کے خلاف ہتھیار نہیں اٹھایا۔ اصل میں جن لوگوں نے آزادی کی جنگ لڑی تھی ان کا مقصد اقتدار حاصل کرنا نہیں تھا۔ چنانچہ انہوں نے تقسیم ہند کے بعد سیاست سے دستبرداری کا اعلان کر دیا تھا۔ کیونکہ اب یہاں سیاست کا مقصد حکومت کا حصول تھا

۔ان لوگوں کا ذہن یہ تھا کہ اب اسلامی ملک بن چکا ہے اور مسلمان حاکم ہو گئے اس لیے ان حاکموں سے مقابلے کی بجائے غیر اسلامی کاموں پر نشاندہی کرنا بہتر ہے۔ مگر ہوا یہ کہ نشاندہی پر گولیاں چلا دی گئیں۔ چنانچہ علماء کے ایک طبقے نے سیاسی دھارے میں شامل ہونے کا فیصلہ کیا۔ اور فیصلہ کیا کہ اسمبلی کے فورم پر جا کر حکومت کی غلطیوں کی نشاندہی کی جائے۔ چنانچہ علماء نے الیکشن میں حصہ لیا اور ۱۹۷۰ء الیکشن میں کچھ علماء کامیاب ہو کر اسمبلی میں پہنچے۔ وہاں پر جب آئین بنایا گیا تو علماء کی کوشش تھی کہ یہ اسلامی آئین ہو۔ مگر ابتدائی مرحلے میں یہ کام مشکل معلوم ہوا۔ مجبوراً علماء نے ۱۹۷۳ء کے آئین پر دستخط کر دیے تا کہ ایک دفعہ آئین بن جائے پھر اس میں اسلامی شقیں داخل کروائی جائیں گی۔ چنانچہ جب آئین بن گیا تو ٹھیک ایک سال بعد ۱۹۷۴ء میں تحریک ختم نبوت چلائی گئی۔ اس تحریک میں بھی کسی قسم کا کوئی تشدد نہیں تھا۔ چونکہ علماء اسمبلی میں موجود تھے انہوں نے اپنا موقف کھل کر بیان کیا۔ باقاعدہ قادیانیوں کے سربراہ کو بلا کر بحث کی گئی۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ قادیانیوں کو متفقہ طور پر غیر مسلم اقلیت قرار دیدیا گیا۔ سب سے بڑی خصوصیت اس میں یہ تھی کہ وہ لوگ جو کہ مذہب کو ذاتی معاملہ سمجھتے تھے انہوں نے بھی علماء کے موقف کو سن کر قادیانیوں کے غیر مسلم اقلیت ہونے کو تسلیم کر لیا۔ اسی طرح آئین میں کئی اور اسلامی شقیں داخل کی گئیں۔ اگر ہتھیار اٹھا لیے جاتے تو یہ معاملات اس طرح سے حل نہ ہوتے۔ مگر اس کے لیے صبر اور تحمل کی بڑی ضرورت ہے۔

اب ہم موجودہ حالات پر نظر دوڑاتے ہیں۔ آجکل ہماری ملک میں بالکل وہی حالات ہیں جو کہ ۱۸۵۷ء کے متصل بعد کے تھے۔ کچھ بھی فرق نہیں ہے سوائے اس کے کہ پہلے برطانیہ ہم پر حکمران تھا اب امریکہ ہم پر حکمران ہے۔ انگریز کا طریقہ کار امریکہ سے مختلف تھا۔ انگریز میں کچھ رکھ رکھاؤ بھی ہے جبکہ امریکہ کے ہاں رکھ رکھاؤ نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد بھی علماء اور مذہبی طبقہ جبر و تشدد کا نشانہ بنا تھا اور آج بھی افغان جنگ کے بعد علماء اور مذہبی طبقہ ہی امریکہ کا تختہ مشق بنے ہوئے ہیں۔ انگریز نے بھی اسلام کے نام پر نئے نئے فتنے پیدا کیے تھے اور آج بھی وہی کچھ ہو رہا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ پہلے زمانے میں میڈیا کا زیادہ کردار نہیں تھا۔ آج گھر گھر میڈیا موجود ہے۔ انگریز نے بھی خود ہی پڑھ لو، خود ہی سمجھ لو، خود ہی عمل کر لو، کی بنیاد پر فکری آزادی کے نام سے فتنے پیدا کیے۔ آج بھی اسی چیز پر میڈیا کے ذریعہ زور دیا جا رہا ہے۔ کوشش یہی ہے کہ کسی نہ کسی طرح سے مولوی سے اس قوم کی جان چھڑا دی جائے اور پھر لوگ اپنی مرضی سے دین کی تشریحات کر کے بددینی اختیار کر لیں۔ اسی لیے دینی مدارس اور علماء کو بدنام کیا جا رہا ہے۔ اس کے اندر سب سے بڑی کوشش یہی جاری

ہے کہ مولوی کو دہشت گرد ثابت کیا جائے۔ اس کے ہاتھ میں جب ہتھیار دیکھا یا جائے گا تو لوگ یہ سمجھیں گے کہ اسلام کا طریقہ یہ نہیں ہے۔

مذہبی طبقہ کے ہاتھ میں ہتھیار کیوں آیا؟ اس کے لیئے دو چیزیں بنیادی حیثیت رکھتی ہیں۔ مسئلہ کشمیر، دوسرا مسئلہ افغانستان۔ اس کے متعلق ہم دوسری مجلس یعنی آئندہ شمارے میں گذارشات پیش کریں گے۔

کیا فرماتے ہیں الطاف حسین نبیرۂ آف مفتی آگرہ؟

الطاف حسین صاحب نے بڑی دیر کے بعد یہ انکشاف فرمایا ہے کہ وہ ہندوستان کے مشہور شہر آگرہ کے کسی مفتی صاحب کے پوتے ہیں۔ یہ سن کر تسلی ہوئی کہ الطاف صاحب بھی ہم مولویوں کے بھی بھائی ہوئے۔ کو ملا نہ ہی نسلا ہی سہی۔ مگر ان کا طرز عمل ایسا ہوتا ہے جیسے کہ کسی ملاں مخالف قبیلے سے انکا تعلق ہو۔ اس لیئے کہ عملی طور پر جب بھی ملاں کے خلاف کہیں جلوس یا جلسہ کرنا ہو تو جناب اپنے ٹیلفون خطاب کے ساتھ کراچی میں کسی ریلی میں آ حاضر ہوتے ہیں۔ مثلا جب ملک کو ملا پچکلہ بنانے کا پروگرام تھا تو جناب الطاف حسین صاحب نے حدود آرڈیننس تبدیل کرانے میں ہراول دستے کا کام دیا۔ نہ جانے اس معاملے میں ان کے مفتی دادا کا کیا فتوی تھا۔ وہ تو اب دنیا میں موجود نہیں ہیں ورنہ ان سے پوچھا جا سکتا۔ پھر جب لال مسجد کا قضیہ شروع کیا گیا تو الطاف حسین صاحب نے ان معصوم اور نادار بچیوں کو بموں کی آگ میں جلانے کے لیئے بنیادی کردار ادا کیا۔ تقریبا روزانہ جلسے اور جلوس سے خطاب فرماتے۔ ان کو وہی عورتیں مظلوم نظر آتیں جو کہ پچکلہ کو آباد کرنے میں حدود آرڈیننس اپنے لیئے بڑی رکاوٹ سمجھتی تھیں۔ مگر انہیں لال مسجد میں بچیوں کی پرواہ کرنے کی بجائے ان کو آگ و خون میں نہلانے میں ہی ان کا حق سمجھا۔ پھر اقلیتوں کے نام پر آجکل وہ زور سے سرگرم ہیں۔ اسلام دشمن سرگرمیوں میں ملوث اقلیتوں کے وہ بہت بڑے خیرخواہ بن کر ابھر رہے ہیں۔ وہ اس لیئے کہ جس ملک نے ان کو پناہ دی ہے انہوں نے اپنے نمک کے حلال کرنے کے لیئے ان پر دباؤ ڈالا ہوا ہے۔ اس لیئے ان کو توہین رسالت سمجھ نہیں آ رہی ہے بلکہ وہ توہین رسالت کرنے والوں سے بڑی ہمدردی کرتے چلے جا رہے ہیں۔ گوجرہ میں توہین قرآن کے سلسلے میں فسادات ہوئے تو جناب الطاف حسین صاحب توہین کنندگان کے حق میں اپنے فن تقریر کی بلاغت دکھاتے ہوئے نظر آئے۔ اور اب اس بات پر زور دے رہے ہیں کہ توہین رسالت کا قانون ہی ختم کر دیا جائے یا کم از کم اس میں اس قسم

کی تبدیلی کر دی جائے جس طرح حدود آرڈیننس میں کر دی گئی تھی۔ اسی طرح وہ قادیانیوں کے معاملے میں بھی بے چین ہیں۔ ان کا رونا نہیں دیکھا جاتا جس طرح وہ قادیانیت کی مظلومیت کا رونا رو رہے ہیں۔ اس پر جب علماء نے گرفت کی تو فوراً اپنے آ گروہی دادا مرحوم کا حوالہ دے دیا۔ اور اپنے عقیدے کا اعلان کر دیا کہ وہ بھی جناب رسالت مآب ﷺ کی ختم نبوت پر یقین رکھتے ہیں مگر ساتھ ہی فرمایا کہ اصل میں قادیانیوں کے ساتھ جو ظلم ہو رہا ہے میں تو اس پر احتجاج کر رہا ہوں۔ سوال تو یہ ہے کہ مظلوم کون ہے قادیانی یا کہ اسلام۔ قادیانیوں نے جس طرح اسلام کو ذبح کیا ہے اس طرح تو آجکل کوئی بھی غیر مسلم نہیں کرتا۔ اب جبکہ جناب الطاف حسین صاحب نے اپنے نسلی مفتی ہونے کا اعلان کیساتھ ساتھ قادیانیوں کے بارے میں اپنے عقیدے کا اعلان کیا ہے تو اس عقیدہ رکھنے کے بعد الطاف حسین صاحب کی ان مظلوم قادیانیوں کے نزدیک کیا حیثیت ہے۔ وہ ہم یہاں بیان کر دیتے ہیں۔ پھر ہم مفتی زادہ الطاف حسین صاحب سے سوال کرتے ہیں کہ ان کا قادیانیوں کے متعلق کیا فتویٰ ہے؟

مرزا غلام احمد قادیانی اپنے منکرین کے متعلق لکھتا ہے۔ ان العدی صاروا خنازیر الفلاء ونسائهم من دونهن الاکلب۔ ترجمہ: میرے مخالف جنگلوں کے سور ہو گئے اور ان کی عورتیں کتیوں سے بڑھ گئیں (دیکھئے مرزا کی کتاب نجم الہدیٰ صفحہ ۱۵۳) ایک اور جگہ لکھتا ہے۔ تلک کتب ینظر الیها کل مسلم و مسلمة بعین المحبة والمودة وینتفع من معارفها ویقبلنی ویصدق دعوتی الا ذریة البغایا۔ ترجمہ: میری ان کتابوں کو ہر مسلمان مرد و زن محبت کی نظر سے دیکھتے ہیں اور ان کے علوم و معارف سے فائدہ اٹھاتے ہیں مگر میری تعلیم و تصدیق سے وہ لوگ گریزاں ہیں جو کنجریوں کے بچے ہیں۔ "بغایا کا یہ ترجمہ (کنجریوں کے بچے) مرزا صاحب نے خود کیا ہے" (دیکھئے مرزا قادیانی کی کتاب نور الحق صفحہ ۱۲۳۔ آئینہ کمالات ۵۴۸)۔ ایک اور جگہ لکھتا ہے "جو ہماری فتح کا قائل نہیں ہوگا تو صاف سمجھا جائے گا اس کو ولد الحرام بننے کا شوق ہے اور وہ حلال زادہ نہیں (دیکھئے مرزا صاحب کی کتاب انوار الاسلام صفحہ ۱۳۰)

مرزا غلام احمد قادیانی کے ان جواہر ریزوں کو دیکھ کر جناب مفتی الطاف حسین صاحب فرمائیں کہ جو اپنے نہ ماننے والے کروڑوں انسانوں کو "سور اور کتیاں، کنجریوں کے بچے، اور ولد الحرام کہے" کیا یہ لوگ اس قابل ہیں کہ ان کو مظلوم تسلیم کیا جائے۔ یہ زبان کسی نبی تو کیا کسی عام شریف انسان کی نہیں ہو سکتی۔ الطاف حسین صاحب اگر محمد ﷺ کی ختم نبوت کے قائل ہیں تو ایسی بازاری لونڈوں والی زبان استعمال کرنے والوں کی حمایت کرنے سے دستبردار ہو جائیں اور اپنی آخرت خراب نہ کریں۔

مکاتیب رئیس الاحرارؒ سے

غلام رسول مہر مرحوم اور رئیس الاحرارؒ میں اہم خط و کتابت

رئیس الاحرار حضرت مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانویؒ کا تقسیم ہند کے بعد سب سے بڑا کام ہندوستان خصوصاً پنجاب میں مسلمانوں کو ان کی مقدس عبادت گاہیں (مساجد اور خانقاہیں) جو کہ تقسیم ہند کے وقت فسادات کی وجہ سے ہندوؤں اور سکھوں کے پاس چلی گئی تھیں ان کو واگزار کروا کر مسلمانوں کو واپس دلانا تھا۔ اس کے لیے رئیس الاحرار نے بڑی محنت کی۔ جس کے مثبت نتائج برآمد ہوئے۔ ان میں پنجاب میں سرہند شریف میں حضرت مجدد الف ثانیؒ اور دہلی میں حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کی خانقاہیں سرفہرست تھیں۔ یہ خانقاہیں چونکہ سکھوں کے قبضے میں تھیں اس لیے رئیس الاحرار کی کوشش تھی کہ اگر سکھوں کے بڑوں سے کسی طرح پرانے مسلمان بزرگوں کے تعلقات ثابت ہو جائیں تو کام بن سکتا ہے۔ مولانا غلام رسول مہر صاحب مرحوم برصغیر کے نامور صحافی اور تاریخ کے موضوع پر دسترس رکھتے تھے اس لیے ان سے اس موضوع پر خط و کتابت کی۔ اس کے بعد رئیس الاحرار کی کوششوں سے یہ دونوں خانقاہیں اور کئی مساجد سکھوں سے واگزار کرا لی گئیں۔

از کوچہ رحمٰن، چاندنی چوک، دہلی ۲ جنوری ۱۹۵۲ء

محترم جناب بھائی مہر صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ امید ہے کہ مزاج بخیر ہوں گے۔ آجکل میری صحت بہت خراب رہتی ہے۔ دل کا مرض تو مستقل ہے۔ یہ تو روح نکلنے کے بعد ہی ختم ہوگا۔ کمزوری اور نقاہت بھی بہت ہے۔ نیز اپنے ذمہ کچھ کام ایسے لے لیے ہیں جو کہ بہت ہی کٹھن ہیں۔ میری کوشش ہے کہ میں یہ کام اپنی زندگی ہی میں کر جاؤں۔ اس وقت سب سے بڑا اہم کام ہندوستان خصوصاً پنجاب میں مسلمانوں کی مساجد اور خانقاہیں ہندوؤں اور سکھوں سے واگزار کرانا ہے۔ اس سلسلہ میں تاریخی حوالوں کے لیے آپ کو تکلیف دے رہا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ اگر ہم سکھوں کے ذہن میں یہ بات ڈالنے میں

کامیاب ہو جائیں کہ ان کے بڑوں اور مسلمانوں کے بڑوں میں اچھے تعلقات تھے۔ تو انہی تعلقات کی یاد دلا کر سکھوں سے اپنی خانقاہیں خالی کرائی جا سکتی ہیں۔ خصوصاً دلّی میں حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کی خانقاہ اور پنجاب میں حضرت مجدد الف ثانیؒ کی خانقاہ۔

دلّی میں حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کی خانقاہ پر سکھوں کا قبضہ ہے۔ میں نے ایک دن وہاں تقریر کی اور کہا کہ تم لوگ حضرت بختیار کاکیؒ کے مزار پر قابض ہو اور اس کی توہین کرتے ہو۔ تمہیں معلوم ہے کہ یہ حضرت بابا فرید گنج شکرؒ کے پیر ہیں۔ اور بابا فریدؒ کی تعلیمات تمہاری ''گرنتھ صاحب'' میں بھی موجود ہیں۔ میں نے کہا کہ اگر تمہارا یہی طریقہ ہے تو تم اپنی گرنتھ صاحب سے بابا فرید کی تعلیمات نکال دو۔ اس پر سکھوں کا ردعمل مثبت دکھائی دیتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اسی طریقہ سے سکھوں سے یہ خانقاہیں خالی کرائی جا سکتی ہیں۔ اس لیے ذرا تفصیل کے ساتھ لکھئے۔

مثلاً بابا فرید گنج شکرؒ کا گورونانک کے ساتھ دوستانہ تعلق تھا نیز گرنتھ صاحب میں بابا فرید صاحب گنج شکرؒ کے قول بھی شامل کیے گئے ہیں۔ حضرت شیخ میاں میر صاحبؒ کے سکھوں کے گرو ارجن جی کے ساتھ گہرے تعلقات تھے اور دربار صاحب امرتسر کی بنیاد بھی انہی کے ہاتھوں رکھی گئی۔ جہانگیر اور گرو ہر بندجی کے درمیان بھی گہرے تعلقات تھے، گرو تیغ بہادر کا واقعہ وغیرہ۔ اس سلسلہ میں جلدی جواب عنایت فرمائیں۔ نیز میری دلی خواہش ہے کہ آپ سے ایک ملاقات ہو جائے۔ اس سلسلہ میں اگر ویزہ وغیرہ کی ضرورت ہو تو میں ویزہ بھجوا سکتا ہوں۔

والسلام۔ حبیب الرحمن لدھیانوی

جواب از غلام رسول مہر مرحوم

یکم فروری ۱۹۵۷ء

حضرت مولانا گرامی نامہ کے لیے شکر گزار ہوں۔ میں نے دو تین مرتبہ آنے کا قصد کیا لیکن اتفاقیہ موانع پیش آتے رہے۔ اب کے مصمم ارادہ ہے صرف ایک دوست کی اطلاع کے انتظار میں متوقف ہوں پھر آپ کو اطلاع دوں گا۔ آپ کی صحت کے حالات وقتاً فوقتاً آنے جانے والوں سے دریافت کرتا رہتا ہوں۔ خدا آپ کو تادیر سلامت رکھے اور مقاصد ہمہ ملّی و قومی کی تکمیل کا موقع عطا

فرمائے۔ استفسارات کے باب میں اجمالاً سن لیجیے۔

(۱) جن بابا فرید کا دوستانہ تعلق گرونانک سے تھا وہ بابا فرید شکر گنج نہ تھے بلکہ اس نام کے ایک اور بزرگ تھے لہذا حضرت شکر گنج اور گرونانک کے زمانے میں موافقت کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔ گرونانک کے دوست بابا فرید کے حالات غالباً سردار موہن سنگھ دیوانہ نے ایک مرتبہ اورینٹل کالج میگزین میں لکھے تھے۔ یہ مئی ۱۹۳۱ء کا نمبر تھا اب اس کا ملنا مشکل ہے۔ لیکن اگر سردار موہن سنگھ سے تفصیلات معلوم نہ ہو سکیں تو لکھ دوں گا۔ انہیں فرید ثانی کہتے ہیں۔

(۲) گرنتھ صاحب کی ترتیب کے بارے میں زیادہ کریدنے کی ضرورت نہیں۔ جس حد تک مجھے علم ہے، اکثر سکھ مصنفین اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں کہ اس میں وہ تمام اچھی چیزیں لے لی گئیں جو اخلاق و اعمال کے تزکیہ کے لئے مفید ہو سکتی تھیں، خواہ وہ سکھ گروؤں کی تھیں یا مسلمان اور ہندو درویشوں کی۔ مثال کے طور پر سردار شیر سنگھ نے سکھ دھرم اور اس کے فلسفے پر انگریزی زبان میں جو کتاب لکھی تھی ''پریم سلسلہ حالات گرو ارجن جی'' اس میں یہ سب کچھ دیکھا جا سکتا ہے یعنی کتاب مذکورہ کی جلد اول میں۔ یہ کتاب اب یہاں نہیں مل سکتی۔ لیکن اگر تفصیل درکار ہو تو فرصت پا کر لکھ سکتا ہوں۔ البتہ گرنتھ صاحب سے حوالے نہیں دے سکتا اس لئے کہ یہ کام میری دسترس سے باہر ہے۔

(۳) شیخ میاں میر اور گرو ارجن جی کے تعلقات کی تفصیل مجھے معلوم نہیں لیکن یہ معلوم ہے کہ دربار صاحب کی بنیاد تیرکاً شیخ موصوف کے ہاتھ سے رکھوائی گئی تھی۔ اگر تفصیلات درکار ہوں تو کچھ دیر انتظار کرنا پڑے گا۔

(۴) گرو تیغ بہادر جی کے واقعہ محزنہ کی کیفیت میرے نزدیک یہ ہے کہ فرد خاندان میں مسند نشینی کے متعلق بلایا گیا تو نہیں غالباً اس بنا پر قتل ہوا کہ گھر کا جھگڑا عام تشکار ہوا اور فیصلہ ایسے فریق سے طلب کیا گیا جو مذہباً گرو صاحب کے نزدیک فیصلے کا حق دار نہ تھا۔ لہذا انہوں نے جان دینے کا فیصلہ کر لیا اگرچہ سکھ مورخین اس بات سے متفق نہیں ہیں، سکھ مورخین کا کہنا ہے کہ اورنگ زیب نے زیادتی سے کام لیا ہے۔

اس بارے میں دو باتیں اور سن لیجیے جو میرے نزدیک بنیادی حیثیت رکھتی ہیں۔

ان مسلم سلاطین کے ہر فعل کو جائز ثابت کرنے کا ذمہ کوئی نہیں اٹھا سکتا، خواہ وہ اورنگ زیب عالمگیر ہی کیوں نہ ہو اور پوری تاریخ کسی قوم کی بھی بے داغ نہیں۔ البتہ حکم لگاتے وقت سب سے پہلے یہ دیکھا جاتا ہے کہ جس شخص کے بارے میں حکم لگانا ہوتا ہے اس کے عام افعال و کردار کی حیثیت کیا ہے؟ اگر اس پر اعتراض کی گنجائش کم ہو تو کسی بظاہر ناگوار فعل کے لئے مناسب توجیہ تلاش کی جائے گی۔ جو بلحاظ حالات معقول ہو ورنہ خلاف حکم لگایا جائے گا۔ گرو ارجن دیوجی کے زمانے سے مغل حکومت اور گرو صاحبان میں اختلافات شروع ہو گئے تھے جن کی حکمت عملی کے بارے میں فیصلہ کرنا مورخین کا کام ہے۔ صرف سکھ گروہی نہیں بلکہ بعض مسلم اکابر بھی اس معاملہ میں ماخوذ ہوئے۔ گرو ہر گوبند جی کے ساتھ جہانگیر کے اتنے گہرے تعلقات تھے کہ ہر وقت انہیں ساتھ رکھتا تھا۔ پھر شاہجہاں کے زمانے میں گرو ہر گوبند جی اور شاہی فوج کے درمیان منازعت پیدا ہو گئی۔ واضح رہے کہ شاہجہاں نے باوجود دعائے دین داری شیخ آدم بنوری کو ہندوستان سے حجاز جانے کا حکم دے دیا تھا۔ اس لئے کہ ان کے ساتھ پٹھانوں کی بہت بڑی جماعت دورہ کرتی رہتی تھی اور دربار میں اس واقعے کو خطرناک صورت میں پیش کیا گیا تھا۔ چنانچہ آدم بنوری کا انتقال مدینہ منورہ میں ہوا۔ بہرحال اگر یہ اجمال کفایت کرے تو خیر ورنہ اطلاع دیجئے کہ میں تفصیلات مرتب کر کے بھیج دوں۔ اس میں وقت ضرور لگے گا۔ آپ کو یہ سن کر خوشی ہوگی کہ آپ کے خاندان کے کچھ حالات مجھے مولانا محمد حسین بٹالوی مرحوم کے رسالے ''اشاعۃ السنۃ'' سے مل گئے لیکن افراد کے حالات مطلوب ہیں۔ کاش آپ انہیں میرے لئے جمع کرا دیں۔ تمام احباب کی خدمت میں سلام پہنچا دیجئے۔

مشتاق زیارت۔ غلام رسول مہر

نوٹ: چنانچہ رئیس الاحرار کی کوششوں سے مسلمانوں کے جہاں اور مساجد و مقابر سکھوں کے قبضے سے واگزار ہوئے وہاں پر خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کی خانقاہ دہلی ۱۹۵۵ء میں اور مجدد الف ثانی کی خانقاہ ۱۹۵۶ء میں واگزار کرائی گئی۔ اور باقاعدہ رئیس الاحرارؒ نے مجدد الف ثانی کے خانقاہ کے متولی خلیفہ مقبول حسین کو پاکستان سے ہندوستان بلا کر گدی پر بٹھایا۔ اس میں رئیس الاحرار کی ساتھ اس وقت مشرقی پنجاب کے گورنر حافظ محمد ابراہیم بجنوری اور وزیر اعلیٰ پرتاپ سنگھ کیرو نے بھرپور ساتھ دیا۔

معاشرت کی اہمیت اور ضرورت

افادات: حکیم الامت حضرت تھانوی رحمہ اللہ

بعد حمد و صلوۃ کے عرض ہے کہ اس وقت دین کے پانچ اجزاء میں سے عوام نے تو صرف دو ہی جزو کو داخل دین سمجھا یعنی عقائد و عبادات، اور علمائے ظاہر نے تیسرے جزو کو بھی دین اعتقاد کیا یعنی معاملات کو مشائخ نے چوتھے جزو کو بھی دین قرار دیا یعنی اخلاق باطنی کی اصلاح کو لیکن ایک پانچویں جزو کو کہ وہ آداب معاشرت ہے قریب قریب ان تینوں طبقوں نے الا ماشاء اللہ اکثر نے تو اعتقاداً دین سے خارج اور بے تعلق قرار دے رکھا ہے اور اسی وجہ سے اور اجزاء سے تو کم و بیش خاص طور پر یا عام طور پر یعنی وعظ میں تعلیم و تلقین بھی ہے لیکن اس جزو کا کبھی زبان پر نام تک نہیں آتا۔ اسی لیے علماً عملاً یہ جزو بالکلیہ نسیاً منسیاً ہو چکا ہے اور میرے نزدیک باہمی الفت و اتفاق میں جو کمی ہے اس کا بڑا سبب یہ سوء معاشرت بھی ہے کیوں کہ اس سے ایک دوسرے کو تکدر و انقباض ہوتا ہے اور وہ رافع و مانع ہے انبساط و انشراح کا جو اعظم مدار ہے الفت باہم دیگر کا۔ حالاں کہ خود اس خیال کو کہ اس کو دین سے کوئی مس نہیں آیات و احادیث و اقوال حکماء دین کے رد کرتے ہیں۔

چناں چہ اس میں بعض بطور نمونہ کے پیش کرتا ہوں: حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ اے ایمان والو! جب تم سے کہا جائے کہ مجلس میں جگہ فراخ کر دو تو جگہ فراخ کر دیا کرو اور جب تم سے کہا جائے کہ کھڑے ہو جاؤ تو کھڑے ہو جایا کرو۔ اور ارشاد ہے کہ دوسرے کے گھر میں گو وہ مردانہ ہو مگر خاص خلوت گاہ ہو بے اجازت لیے مت جایا کرو۔ دیکھیے اس میں اپنے ہم جیسوں کی راحت کی رعایت کا کس طرح حکم فرمایا ہے:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ایک ساتھ کھانے کے وقت دو دو چھوارے ایک دم سے نہ لینا چاہیے تاوقتیکہ اپنے رفیقوں سے اجازت لے لے۔

دیکھئے اس میں ایک خفیف امر سے محض اس وجہ سے کہ بے تمیزی ہے اور دوسروں کو ناگوار ہوگا ممانعت کردی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا ارشاد ہے کہ جو شخص لہسن اور پیاز کھاوے تو ہم سے علیحدہ رہے دیکھئے کہ اس خیال سے کہ دوسروں کو ایک خفیف سی اذیت ہوگی منع فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ مہمان کو حلال نہیں کہ وہ میزبان کے پاس اس قدر قیام کرے کہ وہ تنگ ہوجائے۔ اس میں ایسے امر سے ممانعت ہے جس سے دوسروں کے قلب پر تنگی ہو۔

اور ارشاد فرمایا ہے کہ لوگوں کے ساتھ کھانے کے وقت گو پیٹ بھر جاوے مگر جب تک کہ دوسرے لوگ فارغ نہ ہوجاویں ہاتھ نہ کھینچے کیونکہ اس سے دوسرا کھانے والا شرما کر ہاتھ کھینچ لیتا ہے۔ شاید اس کو ابھی حاجت باقی ہو اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ایسا کام نہ کرے جس سے دوسرا آدمی شرما جائے۔ بعض آدمی طبعی طور پر مجمع میں کسی چیز کے لینے سے شرماتے ہیں اور ان کو گرانی ہوتی ہے یا ان سے مجمع میں کوئی چیز مانگی جائے تو انکار وعذر کرنے سے شرماتے ہیں۔ گو پہلی صورت میں لینے کو جی چاہتا ہو اور دوسری صورت میں دینے کو جی نہ چاہتا ہو ایسے شخص کو مجمع میں نہ دے نہ اس سے مانگے۔

اور حدیث میں وارد ہے کہ ایک بار حضرت جابرؓ در دولت پر حاضر ہوئے اور دروازہ کھٹکھٹایا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کون ہے انہوں نے عرض کیا میں ہوں آپ صلی اللہ علیہ وسلم ناگواری سے فرمایا میں ہوں میں ہوں اس سے معلوم ہوا کہ بات صاف کہے جس کو دوسرے سمجھ سکیں ایسی گول بات کہنا جس کے سمجھنے میں تکلیف ہو الجھن میں ڈالنا ہے۔

اور حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کوئی شخص محبوب نہ تھا مگر آپ کو دیکھ کر اس لئے کھڑے نہ ہوتے تھے کہ آپ کو ناگوار ہوتا تھا۔

اس سے مفہوم ہوتا ہے کہ اگر کوئی خاص ادب وتعظیم یا کوئی خاص خدمت کسی کے مزاج کے خلاف ہو اس کے ساتھ یہ معاملہ نہ کرے گو اپنی خواہش ہوتی چاہتا ہو مگر دوسرے کی خواہش کو اس پر مقدم رکھے بعضے لوگ جو بعض خدمات میں اصرار کرتے ہیں وہ بزرگوں کو تکلیف دیتے ہیں اور ارشاد ہے کہ دو شخصوں کے درمیان جا کر بیٹھنا حلال نہیں بدون ان کے اذن کے اس سے ظاہر ہے کہ کوئی ایسی

بات کرنا جس سے دوسروں کو کدورت ہو نہ کرنا چاہیے۔

اور حدیث میں ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو جب چھینک آتی تو منہ ہاتھ یا کپڑے سے ڈھانک لیتے اور آواز کو پست فرماتے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اپنے جلیس کی اتنی رعایت کرے کہ اس کو سخت آواز سے بھی اذیت و وحشت نہ ہو اور حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ ہم جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آتے تو جس شخص جس جگہ پہنچ جاتا وہاں ہی بیٹھ جاتا یعنی لوگوں کو چیر پھاڑ کر آگے نہ بڑھتا اس سے بھی مجلس کا ادب ثابت ہوتا ہے کہ ان کو اتنی ایذا بھی نہ پہنچائے۔

اور حضرت سعید بن المسیب سے مرسلاً مروی ہے کہ عیادت میں مریض کے پاس زیادہ نہ بیٹھے تھوڑا بیٹھ کر اٹھ کھڑا ہو۔ اس حدیث میں کس قدر دقیق رعایت ہے اس امر کی کہ کسی کی گرانی کا سبب نہ بنے کیوں کہ بعض اوقات کسی کے بیٹھنے سے مریض کو کروٹ بدلنے میں پاؤں پھیلانے میں یا بات چیت کرنے میں ایک گونہ تکلیف ہوتی ہے۔ البتہ جس کے بیٹھنے سے اس کو راحت ہو وہ اس سے مستثنیٰ ہے۔

اور حضرت ابن عباسؓ نے غسل جمعہ کے ضروری ہونے کی یہی علت بیان فرمائی ہے کہ ابتدائے اسلام میں اکثر لوگ غریب مزدوری پیشہ تھے میلے کپڑوں میں پسینہ نکلنے سے بدبو پھیلتی تھی۔ اس لیے غسل واجب کیا گیا تھا پھر بعد میں یہ وجوب منسوخ ہو گیا اس سے بھی معلوم ہوا کہ اس کی کوشش واجب ہے کہ کسی کو کسی سے معمولی اذیت نہ پہنچے۔

سنن نسائی میں حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ شب برات کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم بستر پر سے آہستہ اٹھے اور اس خیال سے کہ حضرت عائشہ سوتی ہوں گی بے چین نہ ہوں آہستہ سے نعل مبارک پہنے اور آہستہ سے باہر تشریف لے گئے اور آہستہ سے کواڑ بند کیے اور یہ سونے والے کی کس قدر رعایت ہے کہ ایسی آواز اور کھڑکا بھی نہ کیا جاوے کہ جس سے سونے والا دفعۃً جاگ اٹھے اور پریشان ہو۔

اور صحیح مسلم میں ہے: حضرت مقداد بن اسود سے ایک طویل قصہ مروی ہے کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مہمان تھے اور آپ ہی کے یہاں مقیم تھے بعد عشا آ کر لیٹ رہتے تھے حضور اقدس

صلی اللہ علیہ وسلم دیر میں تشریف لاتے تو آپ سلام تو کرتے کہ شاید جاگتے ہوں مگر ایسی آواز سے سلام کرتے کہ اگر جاگتے ہوں تو سن لیں اور اگر سوتے ہوں تو آنکھ نہ کھلے۔ اس سے بھی وہی اہتمام معلوم ہوا جو اس سے پہلے حدیث میں معلوم ہوا تھا اور بکثرت حدیثیں اس باب میں موجود ہیں۔

روایات فقہیہ میں ایسے شخص کو جو طعام وغیرہ یا درس یا اوراد میں مشغول ہو سلام نہ کرنا مصرح ہے جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ بلا ضرورت کسی مشغول بہ شغل ضروری کے قلب کو منتشر اور دوجانب کرنا شرعاً ناپسند ہے۔ اسی طرح گندہ دہنی کے مرض میں جو شخص مبتلا ہو اس کو مسجد میں نہ آنے دینا بھی فقہاء نے نقل کیا ہے جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں کی اذیت کے اسباب کا انسداد نہایت ضروری ہے۔

ان دلائل میں مجموعی طور پر نظر کرنے سے بدلالت واضحہ معلوم ہوتا ہے کہ شریعت نے نہایت درجہ اس کا خاص طور سے اہتمام کیا ہے کہ کسی شخص کی کوئی حرکت کوئی حالت دوسرے شخص کے لیے ادنیٰ درجہ میں بھی کسی قسم کی تکلیف واذیت یا ثقل وگرانی یا ضیق وتنگی یا تکدر یا انقباض یا کراہت و ناگواری یا تشویش وپریشانی یا توحش وخلجان کا سبب وموجب نہ ہو اور حضرت شارع علیہ السلام نے صرف قول اور اپنے فعل سے ہی اس کے اہتمام کرنے پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ خدام کے ذریعے اتفاقی کے موقع پر ان کو صحیح آداب پر عمل کرنے پر مجبور فرمایا اور ان سے کام لے کر بھی بتلایا ہے۔

چنانچہ ایک صحابی ہدیہ لے کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بدون سلام واستیذان داخل ہو گئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "باہر واپس جاؤ اور کہو السلام علیکم کیا میں حاضر ہو جاؤں؟" اور فی الحقیقت حسن اخلاق مع الناس کا رأس واساس یہی امر ہے کہ کسی کو کسی سے ایذا کلفت نہ پہنچے جس کو حضور پر نور صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت جامع الفاظ میں ارشاد فرمایا: اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِّسَانِهٖ وَيَدِهٖ۔ اور جس امر سے اذیت ہو گو وہ صورۃً خدمت مالی ہو یا جانی ہو یا ادب وتعظیم ہو جو عرف میں حسن خلق سمجھا جاتا ہے مگر اس حالت میں وہ سب سوء خلق میں داخل ہیں کیونکہ راحت کہ جان خلق ہے مقدم ہے خدمت پر، کہ پوست خلق ہے اور قشر بلا لب کا بیکار ہونا

ظاہر ہے اور گو شعار ہونے کے مرتبہ میں باب معاشرت موخر ہے باب عقائد وعبادات فریضہ سے لیکن اس اعتبار سے کہ عقائد وعبادات کے اخلال سے اپنا ہی ضرر ہے۔ اور معاشرت کے اخلال سے دوسروں کا ضرر ہے۔ اور دوسروں کو ضرر پہنچانا اشد ہے اپنے نفس کو ضرر پہنچانے سے اس درجہ میں اس کو ان دونوں پر تقدم ہے آخر کوئی بات تو ہے جس کے سبب اللہ تعالیٰ نے سورۂ فرقان میں: اَلَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْأَرْضِ هَوْنًا وَ اِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُوْنَ قَالُوْا سَلَامًا۔ کو جو دال ہے حسن معاشرت پر ذکر میں مقدم فرمایا: صلوٰۃ وخشیت واعتدال فی الانفاق وتوحید پر جو کہ باب طاعات مفروضہ وعقائد سے ہے اور یہ تقدم علی الفرائض تو محض بعض وجوہ سے ہے لیکن نفل عبادات پر اس کا تقدم من کل الوجوہ ہے۔

چناں چہ حدیث میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے روبرو دو عورتوں کا ذکر کیا گیا۔ ایک تو نماز روزہ کثرت سے کرتی تھی مگر اپنے ہمسایوں کو ایذا پہنچاتی تھی اور دوسری نماز روزہ نہ کرتی تھی مگر ہمسایوں کو ایذا نہ دیتی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلی کو دوزخی اور دوسری کو جنتی فرمایا۔ اور باب معاملات سے گو اس حیثیت مذکور سے یہ مقدم نہیں۔ کیوں کہ اس کے خلل یعنی کوتاہی سے بھی دوسروں کو ضرر پہنچتا ہے۔ مگر دوسری حیثیت سے یہ اس سے بھی اہم ہے اور وہ یہ کہ گو عوام نہ سہی مگر خواص معاملات کو داخل دین سمجھتے ہیں اور باب معاشرت کو بجز اخص الخواص کے بہت سے خواص بھی داخل دین نہیں سمجھتے اور گو بعض سمجھتے بھی ہیں مگر معاملات کے برابر اس کو مہتم بالشان اعتقاد نہیں کرتے اور اسی وجہ سے عملاً بھی اس کا اہتمام کم کرتے ہیں اور اخلاق باطنی کی اصلاح عبادات مفروضہ کے حکم میں ہے جو حیثیت تقدم معاشرت علی العبادات کی اوپر مذکور ہو چکی ہے وہ یہاں پر بھی جاری ہے۔

غرض اس جزو یعنی باب معاشرت کا سب اجزاء دین سے مقدم اور مہتم بالشان ہونا کسی سے من وجہ اور کسی سے من کل وجہ ثابت ہو گیا مگر باوجود اس کے عوام کا تو بکثرت اور خواص میں سے بعض کا اس کی طرف خود عملاً بھی التفات کم ہے۔ اور جو کسی نے خود عمل بھی کیا مگر دوسروں کو خواہ وہ احباب ہوں یا اپنے متعلق ہوں روک ٹوک یا تعلیم واصلاح کرنا مفقود ہے

رمضان المبارک کے بعد ہم کو کیا کرنا چاہیے!

الحمدللہ رمضان المبارک خیر و عافیت کے ساتھ گذر گیا۔ گو اس میں بجلی، گیس، مہنگائی نے بڑا پریشان کیا، اللہ تعالیٰ ہمارے ان مسائل کو احسن طریقہ سے حل فرمائے۔ رمضان المبارک میں مسلمان ایک پابند زندگی گذارتا ہے، اصل میں مسلمان اپنے آپ کو اپنے اللہ کے حوالے کر دیتا ہے کہ ہم اسی کے حکم کو مانیں گے، نیز اسی کی رضا کے موقعوں کی تلاش میں دن کو روزہ رکھتا ہے، رات کو تراویح میں کھڑا ہوتا ہے، اور اگر ہو سکے تو راتوں کو جاگ کر شب قدر کی تلاش کرتا ہے تاکہ کسی نہ کسی طرح سے اپنے اللہ کو راضی کر لے۔ رمضان المبارک ہی میں مسلمان کے ایمان کی پختگی ظاہر ہوتی ہے۔ بڑے بڑے اس مہینے میں روزہ رکھنے سے کتراتے بھی ہیں، مگر جو واقعی اہل ایمان ہیں وہ جب بھی اس مہینے کو پاتے ہیں تو اس میں روزہ ضرور رکھتے ہیں۔ رمضان کی برکت یہ ہے کہ اس میں کئی ایسے لوگ بھی راہِ راست پر آجاتے ہیں جو کہ عام حالات میں بھٹکے ہوئے ہوتے ہیں۔ مختصر یہ کہ اس مہینے میں مسلمان کے ایمان کا امتحان ہو جاتا ہے۔ کامیاب وہی ہوتا ہے جو کہ اس مہینے کی قدر کرے۔ اس کے ضابطوں کو سمجھے، اس کی فضیلتوں کو سمجھے اور ان پر عمل کرے۔

رمضان المبارک کا مہینہ اصولی طور پر مسلمانوں کو اعمال کی مشق کراتا ہے۔ اس مہینہ پر اللہ تعالیٰ کی ذات پر جتنا یقین بڑھ جاتا ہے وہ کسی اور وقت میں نہیں۔ اس مہینے میں گناہ کرتے ہوئے انسان زیادہ ڈرتا ہے۔ خاص کر روزے کے دوران اللہ کی ذات پر جتنا یقین ہوتا ہے اس کی انتہاء نہیں۔ آدمی جب روزہ رکھ لیتا ہے تو اس کا عزم ایسا پختہ ہوتا ہے کہ کوئی بھی پریشانی یا لالچ اس کو روزہ توڑنے پر آمادہ نہیں کر سکتی۔ سوائے معذوری کے۔ انسان اگر روزہ توڑنا بھی چاہے تو اللہ کا یقین روزہ توڑنے نہیں دیتا۔ مثلاً اگر کوئی شخص روزہ دار ہے اور اکیلا کمرے میں موجود ہے کوئی اس کے پاس نہیں، اس کے کمرے میں فریج وغیرہ موجود ہے اس میں ٹھنڈے مشروب رکھے ہوئے ہیں۔ اس کے دل میں خیال آتا ہے کہ کوئی مجھے دیکھ نہیں رہا، اگر میں کچھ کھا پی لوں گا تو کسی کو میرے روزہ توڑنے کا علم نہیں ہوگا۔ چنانچہ وہ ٹھنڈے مشروب کا گلاس بھر کر اپنے منہ کے قریب لے جاتا ہے۔ ابھی پینے ہی والا

ہوتا ہے تو معاً اس کے دل میں خیال آتا ہے کہ اگرچہ مجھے کوئی نہیں دیکھ رہا مگر مجھے میرا اللہ تو دیکھ رہا ہے یہ خیال آتے ہی وہ ٹھنڈے شروب سے بھرا ہوا گلاس اپنے منہ سے ہٹا دیتا ہے۔ یہی گلاس کو اللہ کے خیال آنے سے ہٹا دینا اللہ کی ذات پر پختہ یقین ہونے کا ثبوت ہے۔

رمضان المبارک میں اللہ کی ذات پر اسی پختہ یقین کا تقاضا ہے کہ اس کو صرف رمضان تک ہی محدود نہ رکھا جائے بلکہ اس کو پورا سال رہنے دیا جائے۔ اگر اس کو زندگی کا مقصد بنایا جائے تو مسلمان کی دنیا و آخرت کی فلاح کے لیے کافی ہے۔ رمضان المبارک میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے عام معافی کا اعلان کیا جاتا ہے۔ اگر کوئی بھٹکا ہوا اللہ کے دربار میں آ جائے اور اپنے گناہوں کی معافی مانگے وہ گناہ چاہے جتنے بھی بڑے اور زیادہ ہوں اللہ تعالیٰ اپنی رحمت خاص سے معاف فرما دیتے ہیں۔ اسی طرح مسلمان سارا سال اپنے گناہوں کی معافی مانگتا رہے تو گناہوں کی طرف توجہ نہیں جاتی۔ رمضان میں عفو و درگزر سے اللہ کام لیتے ہیں اسی طرح انسان کو بھی سارا سال عفو و درگزر سے کام لینا چاہیے۔ رمضان المبارک کے روزہ سے مسلمان کے دل میں ناداروں کی بھوک اور افلاس کا احساس ہوتا ہے تو دیکھا گیا ہے کہ لوگ رمضان المبارک میں کثرت کے ساتھ مالی طور پر ضرورت مندوں کی مدد کرتے ہیں اگر اسی چیز کو پورا سال جاری رکھا جائے تو شاید کوئی بھوکا یا ننگا نہ رہے۔ اصل میں رمضان المبارک کا مہینہ عبادات کے ساتھ ساتھ معاشرتی ارتقا کا ذریعہ بھی ہے۔ اس میں درگزر، دوسرے کی مدد، قناعت، جفاکشی، قوت برداشت جیسے اعمال سے مسلمان کی تربیت کی جاتی ہے جس پر عمل کرنے سے ایک بہترین معاشرہ تشکیل پاتا ہے۔ اسلام صرف عبادات کی ہی تلقین نہیں کرتا بلکہ ایک اچھے صاف ستھرے بے ضرر معاشرے کی تشکیل پر بھی زور دیتا ہے۔ اچھے معاشرے کی تشکیل ذاتی زندگی سے شروع ہو کر اجتماعی ماحول پر اثر انداز ہوتی ہے۔

رمضان المبارک اب گذر چکا ہے اب یہ مہینہ سال کے بعد آئے گا۔ نہ جانے کس کی قسمت میں اگلا رمضان لکھا ہے۔ اس لیے ہمارے لیے لازم ہے کہ ہم پورے سال کو ہی رمضان بنا کے رکھیں۔ سارا سال ہمارا طرز عمل ہمیں بتائے کہ رمضان کے جانے کے بعد اس کی دی ہوئی مشق سے ہم فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ نماز کی پابندی ویسی ہی رہے۔ نوافل میں مستقل مزاجی رہے۔ قناعت ہمارا شیوہ بن جائے۔ غریب و نادار کی مدد اسی طرح جاری رکھیں گناہوں سے نفرت اسی طرح رہے جس طرح رمضان میں تھی۔ جھوٹ، مکر و فریب سے اجتناب کریں۔ دوسرے کو تنگ نہ کریں۔ کسی کا حق نہ ماریں۔ اپنے اندر قوت برداشت پیدا کر لیں تو سمجھیں کہ رمضان میں عبادات کرنے کا مقصد پورا ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

آگ ہے "اولادِ ابراہیم ہے" نمرود ہے

اوریا مقبول جان

امریکہ کے چند اخبارات میں ابھی صرف معلومات کے سرے پکڑنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ اندرونِ خانہ جو کچھ ہونے والا ہے اس کی خبر نکالنے کی کوشش ہو رہی ہے۔ اسی بڑی خبر اور چھپے ہوئے رازوں سے پردہ اٹھانے میں صحافی سرگرداں ہیں اور ادھر ہمارے کاسہ لیسوں کی صفوں میں خوشی کے شادیانے بج رہے ہیں۔ خبر آئی ہے کہ عراق میں جو اسلحہ اور جنگی ساز و سامان امریکی فوج استعمال کر رہی تھی اگلے سال تک یعنی امریکی فوجوں کے انخلا تک سب کا سب پاکستان پہنچا دیا جائے گا۔ امریکی صحافی اس فیصلے کے مقاصد کی تلاش میں ہیں کہ ایسا وہاں کیا ہونے جا رہا ہے کہ بکتر بند گاڑیوں کی قطاروں اور ٹینکوں کے قافلوں کے قافلے جدید ترین اسلحوں سے لیس اور عالمی سیٹلائٹ نظام سے منسلک گلیوں، کوچوں اور مکانوں میں جنگ لڑنے والے متعدد آلات کیوں وہاں بھیجے جا رہے ہیں۔ مغربی میڈیا اس خبر کی اہمیت اور اس کے پیچھے چھپے ہوئے عزائم جاننا چاہتا ہے۔ دوسری جانب ہمارا عالم یہ ہے کہ ہمارے دفاعی تجزیہ کار اچھل اچھل کر کہہ رہے ہیں کہ اس سے پاکستان کی فوج مضبوط ہوگی اور ہماری ہندوستان پر بالادستی مستحکم ہو جائے گی۔ دوسری جانب وہ کہ جن کی خرید و فروخت کا بازار گرم ہے۔ جن کے علم و فن اور عقل و دانش کی قیمتیں لگانے والے سات سمندر پار سے لوگ آ چکے ہیں، ان کے نزدیک اگر یہ اسلحہ پاکستان آ گیا تو ہماری "دہشت گردوں" اور دقیانوسی قسم کے لوگوں پر گرفت مضبوط ہو جائے گی۔

بات یہ بھی درست ہے کہ اگلے سال کے درمیان تک امریکہ عراق سے واپس ہونا چاہتا ہے۔ یہ بات بھی سچ ہے کہ اس کا وہ اسلحہ جو عراق میں موجود ہے اور وہ ساز و سامان جس سے فلوجہ، کوفہ اور کربلا کے شہریوں پر ظلم و تشدد اور بربریت کی تاریخ رقم کی گئی۔ یہ خون آلود ساز و سامان پاکستان آ رہا ہے۔ جب یہ دونوں حقیقتیں ہیں تو پھر خوشی کا مقام تو ان لوگوں کی ضرورت ہے جو گزشتہ ساٹھ سال سے اپنے نہتے عوام کو فتح کر کے سینے پر تمغے سجاتے آئے ہیں اور مبارکباد کا مقام ان علمی استعمار کے پروردہ انسانی حقوق، عدل اور سماجی و معاشی انصاف کے نعروں کے علمبردار دانشوروں کے لیے جن کی

نظر میں امن اس وقت قائم ہی نہیں ہو سکتا، انسانی حقوق اس وقت تک پوری طرح ادا ہی نہیں کیے جا سکتے جب تک دنیا بھر کے میڈیا کو ان علاقوں سے نکال کر لوگوں پر زندگی اس قدر تنگ کر دی جائے کہ لاکھوں بے گھر ہو جائیں، ہزاروں زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھیں، اور معذوروں کی تو گنتی بھی ضروری نہیں۔ ان خوشخبریوں کے بعد ذرا ایک نظر تو ملاحظہ کریں کہ عراق میں موجود ہتھیار کس قسم کے ہیں اور کس کام آتے ہیں۔ امریکی پینٹاگون نے عراق سے وہ تمام ہتھیار پاکستان منتقل کرنے کے لیے کانگریس کو لکھا ہے جو وہاں پر صدام حسین کی افواج کی شکست کے بعد ہر شہر میں اٹھنے والی بغاوت اور خانہ جنگی کا مقابلہ کرنے کے لیے وہاں بھیجے گئے تھے۔ یوں تو ان میں امریکی سپاہیوں کے لیے بنائی جانے والی خصوصی بکتر بند گاڑیاں، رات کو دیکھنے والے آلات، سیٹلائٹ کے ذریعے چھپے دشمنوں تک رسائی والے آلات اور ایسی بہت سی اشیا شامل ہیں جو گزشتہ دس سالوں میں امریکہ نے خاص طور پر شہروں کی لڑی جانے والی لڑائی کے لیے تیار کیے ہیں۔ لیکن عوام پر استعمال کرنے کے لیے جو اسلحہ امریکی فوج کا محبوب اور مرغوب ہے وہ اس قدر خطرناک ہے کہ اس کو سوچ کر روح کانپ اٹھتی ہے۔ امریکی صحافی اور دانشور ولیم بلم نے اپنی مشہور زمانہ کتاب Rougue State میں ایک باب ان امریکی ہتھیاروں کی، ان ممالک کی جہاں یہ استعمال ہوئے اور ان اثرات کے جو وہاں کے عوام پر مرتب ہوئے۔ عراق میں ایسے تمام ہتھیار موجود ہے اور استعمال ہو رہے ہیں۔ ان بموں اور میزائلوں کے علاوہ سب سے خطرناک Depled Urinium ہے جسے وہاں کے شہریوں پر پہلی عراق جنگ سے اب تک استعمال کیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک رپورٹ کے مطابق اس وقت عراق میں ۱۵ لاکھ کے قریب کینسر کے مریض ہیں جو اپنی موت کی راہ دیکھ رہے ہیں۔ دوسرا ہتھیار وہ کلسٹر بم ہیں۔ آپ حیران ہو جائیں گے کہ پہلی عراق جنگ میں تقریباً ۳ ملین یا تین کروڑ کلسٹر بم گرائے گئے جن میں سے ایک کروڑ پچاس لاکھ پھٹ نہ سکے۔ ان بموں کے علاوہ عراق میں تقریباً ہر شہر اور ہر علاقے میں جہاں ذرا سی بھی مزاحمت ہوئی کیمیائی ہتھیاروں کا بے دریغ استعمال کیا گیا۔ امریکہ نے یہ استعمال پہلی بار ۱۹۲۰ء میں بیالارز میں کیا تھا اور پھر اس کے بعد چین، کوریا، ویتنام، لاؤس، پانامہ، کیوبا، اور دیگر ممالک میں اس کا استعمال جاری رکھا۔ عراق میں یہ سب ہتھیار موجود ہیں جو پاکستان آ سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ عراق کے تقریباً ہر بڑے شہر میں عقوبت خانے قائم کیے گئے اور لوگوں کو اذیتیں دینے اور مار پیٹ کر

نے کے مختلف آلات نصب کیے گئے۔ ہو سکتا ہے یہ سب ہمارا مقدر بن جائیں۔

یہ سب کہاں استعمال ہوں گے اور سب سے بڑا سوال یہ ہے کہ کون استعمال کرے گا۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ ان میں سے کوئی بھی ہتھیار جو عراق میں استعمال ہو رہا ہے وہ بارڈر پر لڑنے کے لیے نہیں ہے۔ یعنی یہ سب کے سب اگر فوج کے پاس آ بھی جائیں تو بھارت پر ایک فیصد بھی برتری حاصل نہیں ہوگی۔ ہاں البتہ یہ سب ہتھیار اپنے شہروں میں سروں کو کچلنے، الحق آوازوں کا گلا دبانے، بغاوتوں کو کچلنے اور اپنے شہروں کو خود فتح کرنے اور پھر ان پر فخر کے ساتھ اپنا جھنڈا نصب کرنے کے کام آ سکتے ہیں۔ یہ کام تو ہم گزشتہ ساٹھ سالوں سے خوش اسلوبی سے کر رہے ہیں لیکن عراق سے آنے والے ان ہتھیاروں کو استعمال کون کرے گا۔ یہ وہ سوال ہے جس کا جواب میں جتنی دفعہ سوچتا ہوں مجھے اسلام آباد میں 18 ایکڑ پر پھیلی تاحد نظر امریکی ایمبیسی کی عمارت یاد آنے لگتی ہے۔ دنیا کی بدنام ترین اور متعصب ترین کرائے کے فوجیوں کی تنظیم بلیک واٹر جو اپنا نام بدل کر Xe کے طور پر کام کر رہی ہے اس کے دندناتے ارکان یاد آنے لگتے ہیں۔ ہر علاقے میں خریدا یا کرائے پر لیا گیا گھر جس میں تمام آلات نصب ہوتے اور جن کے باہر عراق سے آنے والے امریکی کھڑے ہوتے۔ یہ سب سامان ابھی وہاں سے روانہ نہیں ہوا لیکن اس کے استعمال کرنے والے پہلے آ پہنچے ہیں۔ میرے ملک کے شہروں میں کھلی ہوئی سیکورٹی ایجنسیوں سے سابقہ فوجیوں خصوصاً کمانڈوز کو بھرتی کرنے کے لیے کہا جا رہا ہے۔ ایسے میر جعفروں کی ٹریننگ ہو رہی ہے۔ انگریز جب بنگال کی سرزمین پر اترا تھا تو نہتا تھا اور اس کے ساتھ چند سپاہی تھے لیکن ۱۷۵۷ء میں جب اس نے پلاسی کے میدان میں سراج الدولہ کو شکست دی تو اس کے ساتھ یہاں کے مقامی باشندوں پر مشتمل لشکر تھا جسے یہ درس دیا گیا تھا کہ انگریز آئے گا تو علم آئے گا، خوشحالی آئے گی۔ یہ درس بکاؤ دانشور دیتے تھے اور لڑنے والے بکاؤ جوان اپنے ہی شہر فتح کرتے تھے۔ اب بھی ویسے ہی دانشور، تجزیہ نگاروں کی گفتگو اور لوگوں کا جوق در جوق خریدے جانا، ایک اور پلاسی کا میدان سجنے والا ہے، ایک اور سرنگاپٹم کے قلعے میں ٹیپو کی موت کے خواب دیکھے جا رہے ہیں۔ میر جعفروں اور میر صادقوں کی قطاریں لمبی ہوتی جا رہی ہیں اور میرے وطن کی عزت و ناموس اور غیرت و حمیت کی حفاظت کی قسم کھانے والے گہری نیند کے مزے لوٹ رہے ہیں۔

حدیث نبوی کی ادبی خصوصیات

[illegible]

ضرورت حدیث:

جس طرح پروردگار کائنات نے سیدنا آدم علیہ السلام سے لے کر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک انبیاء مبعوث فرمائے اور ان کو کتب وصحائف بھی عطا فرمائے۔ ان کتب وصحائف کی تشریح وتوضیح بھی اس ذات بے نیاز نے فرمائی۔

چنانچہ قرآن مجید آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا جس ذات نے اس کو نازل فرمایا اسی ذات نے بزبان محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کی توضیح بھی فرمادی جو کہ حدیث کے نام سے موسوم ہے۔ اب رہی اس کی ضرورت، تو یہ زندگی کا عام تجربہ ہے اور حقیقت ہے کہ بات کرنے والا اپنی بیان کردہ بات کے مقصد اور توضیح بیان کرنے پر زیادہ قادر ہوتا ہے۔ جیسے ایک دوست دوسرے دوست کے ہاں یہ تحریر کرے کہ کیا بات ہے۔ چنانچہ اس فقرہ میں مطالب کثیرہ کا استعمال ہے۔ سوال کے لئے تحقیر کے لئے عظمت کے لئے تعجب کے لئے وغیرہ ذالک۔

یعنی اس تحریر شدہ عبارت کا مطلب وہ عبارت بیان کرنے سے قاصر ہے جب تک تحریر کنندہ خود نہ وضاحت کرے۔ اسی طرح قرآن مجید کا مطلب ومفہوم بھی بغیر صاحب کتاب وحامل کتاب (صلی اللہ علیہ وسلم) کے کسی کے بس کی بات نہیں اور نہ غیر حاکی توضیح قابل اطاعت وایمان ہے۔

چنانچہ امام اعظم ابوحنیفہ فرماتے ہیں "لولا السنۃ ما فہم احدا منا القرآن" کہ اگر حدیث نبوی نہ ہوتی تو کوئی ماں جایا اس کی توضیح نہ کرسکتا۔

چنانچہ امام جلال الدین سیوطیؒ (درمنثور میں) رقم فرماتے ہیں۔

"اخرج ابن ابی حاتم من طریق مالک بن انسؓ عن ربیعۃ قال ان اللہ تبارک و تعالیٰ انزل الیک الکتاب مفصلاً و ترک فیہ موضعا للسنۃ" (درمنثور)

فرمایا کہ پروردگار نے آپؐ پر قرآن مجید مفصل اتارا اور اس میں حدیث کی گنجائش بھی رکھی۔ جمیع انسان یکساں فہم وفراست کے مالک نہیں ہوتے اور جمیع افراد کی حاجات بھی

یکساں نہیں ہوا کرتیں۔ بنابریں یہ ناممکن ہے کہ جو کلام جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش فرمایا اس کے متعلق افہام و تفہیم کی ضرورت پیش نہ آئی ہوگی اور آیت کا سماع کرتے ہی صحابہ کرام اس کے جمیع مرادات سے باخبر ہو گئے ہوں گے۔

چنانچہ ایسے واقعات بکثرت کتب حدیث میں موجود ہیں کہ کسی نے آیت قرآنی کی مراد اصل مفہوم سے ہٹ کر بھی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی اصلاح فرما دی۔

چنانچہ جب آیت!

نازل ہوئی تو حضرت عدی ابن حاتمؓ نے سفید و سیاہ دھاگہ اپنے پاس ابیض و اسود کی امتیاز کے لئے رکھا تو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے معلوم ہونے پر فرمایا کہ اس سے مراد صبح کی سفیدی اور رات کی سیاہی ہے۔

بنابریں قرآن مجید میں ہے۔

"انا انزلنا الیک الذکر لتبین للناس ما نزل الیھم O

حقیقت یہ ہے کہ کوئی کتاب ایسی نہیں کہ ان لامحدود جزئیات کو حاوی ہو۔ چنانچہ عقائد، عبادات، اخلاق کے جمیع ابواب قرآن مجید میں مذکور ہیں مگر وہ ہیں ان کی توضیح، تفصیل، تحدید، تعیین کے لئے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال کی ضرورت ہے۔

مفہوم حدیث

لفظ حدیث عربی زبان میں متنوع معانی کا حامل ہے۔

1- بات چیت اور گفتگو کے معنی میں بھی مستعمل ہے جیسا کہ قرآن مجید میں ہے۔

فبای حدیث بعدہ یؤمنون O

پس وہ اس کے بعد کس بات پر ایمان لاویں گے۔

یا جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بوقت خطبہ یوں فرمایا کرتے تھے۔

ان احسن الحدیث کتاب اللّٰہ O

بے شک بہترین کلام اللہ کی کتاب ہے۔

2- نئی چیز اور نئی بات کو بھی حدیث کہتے ہیں حادثہ کو بھی اسی لئے یہ نام دیا گیا ہے کہ وہ وقوع

کے اعتبار سے نیا ہوتا ہے اور بدعات کو محدثات کہا گیا ہے۔

3- ظہور اسلام سے قبل اہل عرب حدیث کے لفظ کو اخبار کے معنی میں بھی استعمال کرتے تھے۔ چنانچہ امام بلاذریؒ نے رقم فرمایا ہے کہ دورِ جاہلیت میں عرب اپنے مشہور ایام کو احادیث سے تعبیر کرتے تھے۔ (فتوح البلدان ص ۳۹)

۴ حدیث کا لفظ ضرب المثل کے معنی میں بھی مستعمل ہے جیسا کہ عربی محاورہ ہے کہ صار حدیثا کہ فلاں بات ضرب المثل بن گئی۔ جیسے ابوکلدہ کا شعر ہے۔

ولا تصبحوا احدوثة مثل قائل

به يضرب الامثال من يتمثل

5- مشہور نحوی امام فراءؒ کے نزدیک حدیث کی جمع احدثہ اور احدثہ کی جمع احادیث ہے۔ چنانچہ لفظ حدیث کے مادّہ کو جس طرح بھی تعبیر دیتے جائیں اس میں خبر دینے کا مفہوم ضرور باقی ہوگا۔ جیسا کہ ابو البقاءؒ نے فرمایا ہے کہ "حدیث کا لفظ تحدیث سے اسم ہے اور تحدیث کا مفہوم خبر دینا ہے پھر اس قول، فعل اور تقریر کو حدیث کہنے لگے جو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب ہو۔"

حدیث کا اصطلاحی مفہوم

1- اسلامی اصطلاح میں علم حدیث سے وہ علم مراد ہے جس میں سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے افعال و اقوال ذکر کیے گئے ہوں۔

2- اصطلاحِ شرعی میں حدیث سے وہ اقوال و افعال مراد ہیں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب منسوب ہوں۔ گویا حدیث کا لفظ قرآن کے مقابلہ میں بولا جاتا ہے۔ اس لئے کہ قرآن قدیم ہے اور حدیث اس کے مقابلے میں جدید ہے۔

3- چنانچہ خود جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول کو حدیث کا نام دیا۔

فقال لقد ظننت یا ابی هریرة ان لا یسئلنی احد عن هذا الحدیث اول منك لما رأیت من حرصك علی الحدیث۔(بخاری ج ۲ ص ۹۷۲)

"آپؐ نے فرمایا اے ابوہریرہؓ مجھے بھی یقین تھا کہ اس حدیث کے بارے میں مجھ سے پوچھنے میں آپؓ سے کوئی سبقت نہیں لے گا کیونکہ آپؓ احرص علی الحدیث ہیں۔

۴ مقدمہ مشکوٰۃ میں مرقوم ہے۔

"اعلم ان الحدیث فی اصطلاح جمہور المحدثین یطلق علی قول النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم وفعلہ و تقریرہ " تقریر سے مراد ہے کہ کسی نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کوئی بات کہی یا کوئی فعل کیا تو آپ نے نہ روکا! بلکہ خاموشی اختیار فرمائی۔

حدیث کی ادبی خصوصیات

1- آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش ایک ایسے خطہ میں ہوئی جو اپنے ماسوا عجمی (گونگا) کے نام سے موسوم کرتے تھے اور خود کو عرب یعنی فصاحت وزبان آوری میں بے مثال تصور کرتے تھے۔ چنانچہ تاریخ ارض القرآن میں مرقوم ہے:

"عرب اعراب سے مشتق ہے جس کے معانی زبان آور اور اظہار مافی الضمیر کے ہیں۔ چنانچہ عرب کی قوم نہایت زبان آور و فصیح اللسان تھی اس لئے اسے اپنا نام عرب رکھا۔

2- علاوہ ازیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رضاعت بھی بنی سعد جیسے لسانی طور پر فصیح و بلیغ قبیلہ میں ہوئی۔ چنانچہ سیدنا حضرت علیؓ نے ایک دفعہ آپ سے دریافت کیا کہ ہم ایک ہی خاندان سے ہیں اور ایک ہی شہر میں رہنے والے ہیں لیکن آپ کو بہت زیادہ فصیح اللسان ہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا!

ادبنی ربی فاحسن تادیبی و نشات فی سعد بن بکر ○

یعنی مجھے میرے پروردگار نے بہترین ادب سے بہرہ ور فرمایا ہے اور میری نشوونما بھی سعد بن بکر جیسے فصیح اللسان قبیلہ میں ہوئی ہے۔

3- سیدنا ابوبکرؓ نے ایک دفعہ آپؐ سے کہا "یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لقد طفت فی العرب و سمعت فصحائھم فما سمعت افصح منک قال ادبنی ربی و نشات فی بنی سعد ○ (فروغ عربی)

کہ میں سارے عرب میں گھوما ہوں اور ان کے فصحاء کے کلام سنے ہیں لیکن آپؐ سے زیادہ فصیح کسی کو نہیں پایا۔

4- چنانچہ مواہب اللدنیہ میں حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ

وکان یقول انا افصح العرب ○

آپ فرمایا کرتے تھے کہ میں خطۂ عرب میں سب سے زیادہ فصیح اللسان ہوں۔

4- قاضی عیاض رقمطراز ہیں کہ:

لسانی فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا مرتبہ بہت بلند تھا۔ کلام میں پختگی اور آغاز گفتگو کے اسلوب میں بے نظیر خصوصیت کے حامل تھے۔ آپ کی گفتگو فصیح اور واضح الفاظ سے مرصع تھی جو تنافر اور نامانوس ہونے کے شائبہ تک سے پاک تھی۔ آپ کے کلام میں نہ کوئی رکیک لفظ ہوتا اور نہ کہیں جھول دکھائی دیتا اور نہ تکلف و تصنع پایا جاتا تھا۔ (الشفاء ص ۵۹)

5- حسن کلام: حدیث ادبی حیثیت سے ایک حسین ترین کلام کا مرقع ہے۔ چنانچہ یہ ایک ایسا کلام ہے کہ جو باتیں دوسرے کلام میں باعث عیب ہوتی ہیں، وہ حدیث میں باعث تحسین ہوتی ہیں۔ مثلاً اگر تثنیہ کا صیغہ کلام واحد میں تکرار سے لایا جائے تو کلام بھدے پن کا شکار ہو جاتا ہے۔ لیکن یہی بات اگر حدیث میں دیکھیں تو باعث زینت ہے جیسا کہ بخاری شریف کی آخری حدیث ہے۔

"کلمتان حبیبتان الی الرحمن خفیفتان علی اللسان ثقیلتان فی المیزان سبحان اللّٰہ و بحمدہ سبحان اللّٰہ العظیم" (بخاری ج ۲)

7- **اعلیٰ تشبیہات**: آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بات ذہن نشین فرمانے کی غرض سے ایسی دلنشیں تشبیہات بیان فرمائی ہیں جو ندرت سے مزین اور تشبیہی وتمثیلی کا شاہکار ہیں۔

جیسا کہ یہ حدیث ہے کہ:

"ایک قوم کشتی میں قرعہ اندازی کے بعد سوار ہو جائے اور ان میں سے نچلی منزل والا کوئی آدمی اپنی جگہ کو کلہاڑی سے توڑنا شروع کر دے اور وہ پوچھنے پر کہے کہ یہ میری اپنی جگہ ہے جو چاہوں سو کروں۔ اگر اس کو ہاتھ سے پکڑ لیا جائے تو وہ بھی بچ جائے گا اور وہ سب بھی بچ جائیں گے ورنہ سب کے سب غرق ہوں گے۔

اوکما قال صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

8- جامع: حدیث پاک نہایت عظیم جامعیت کے مقام پر فائز ہے۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

إنی اوتیت جوامع الکلم

جو بات بھی آپ فرماتے تھے۔ نہایت جامع ہوتی تھی۔ جیسا کہ ایک بدو نے وقوع قیامت کے بارے میں سوال کیا، تو آپ نے زیادہ تفصیل سے احتراز اور اس کے ذہن کو مدنظر رکھتے ہوئے فرمایا:

اذا ضیعت الامانۃ

جب امانتیں ضائع کر دی جائیں گی۔

تو اس نے عرض کیا کہ کیسے ہوں گی؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا! اذا وسد الامر الی غیر اھلہ، یعنی قیامت کا وقوع اس وقت ہوگا جب امور ان کے نااہل لوگوں کے سپرد کر دیئے جائیں گے۔

9- ایجاز و اختصار! حدیث شریف نہایت ایجاز و اختصار کی صفت سے مزین و موصوف ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم زائد از ضرورت الفاظ استعمال نہیں فرماتے تھے، بلکہ اختصار کے وقت اختصار سے کام لیتے اور تشریح کے وقت توضیح سے کام لیتے۔ جیسا کہ جاحظ نے بیان کیا ہے۔

واستعمل المبسوط فی موضع البسط والمقصور فی موضع القصر و هجر الغریب الوحشی ورغب عن الهجین السوقی فلم ینطق الا عن میراث حکمۃ۔ (البیان والتبیین)

اور اختصار نہایت سلیس اور عام فہم ہوتا، جیسے ا۔الصوم جنۃ ۲۔انما الاعمال بالنیات ۳۔المرء مع من احب وغیرہ

10- سجع و کہان سے منزّہ!

حدیث پاک سجع وکہان سے منزہ ہے جبکہ اسلام سے قبل سجع وکہان نہایت زوروں پر تھا اور اشعار کا بھی چرچا تھا۔

لیکن آپ نے نہ سجع وکہان استعمال کیا اور نہ ہی شعر کی جانب توجہ مبذول کی۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم صاحب طرز اور صاحب اسلوب متکلم تھے۔ ایک سو سے زیادہ علوم حدیث کی بنا پر وجود میں آئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیشہ کے لئے خطابت کا معیار قائم فرمادیا اور وعظ وتبلیغ کا منفرد اسلوب پیش کیا، نثر کا ایک اعلیٰ ترین اور دائمی و مستقل معیار مقرر فرمادیا۔

انوارِ انوری

احوال و واقعات خاتم المحدثین حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ

قسط نمبر: 30

شیخ المشائخ حضرت مولانا محمد انوری

حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ میں جب کانپور پڑھاتا تھا۔ تو یہ معمول تھا کہ شعبان میں جب میں تھانہ بھون آتا تو گنج مراد آباد حضرت مولانا فضل الرحمن رحمۃ اللہ علیہ کی زیارت کرکے آتا۔ ایک دفعہ میں جب حاضر ہوا تو بیٹھتے ہی حضرت مولانا فضل رحمن صاحب نے فرمایا کہ مولانا یہ جو حدیث میں آتا ہے اللھم اعطنی نشر فالی لقائک شوق کا کیا مطلب ہے۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت ہی فرمائیں۔ مجھے تو شوق کے معنی نہیں آتے۔ تو حضرت نے فرمایا شوق کے معنی ہیں تڑپ یعنی اے خدا اپنے دیدار کی تڑپ عنایت فرما یعنی یہ غم لگا رہے کہ ہائے میں نے کچھ نہیں کیا۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے۔

یہاں جو درخور توفیق غم پائے نہیں جاتے
انہیں راز دروں پہ وہ سمجھائے نہیں جاتے

یعنی سارے غموں کو چھوڑ کر فقط ایک اس کے دیدار کا غم لگا رہے۔ جیسا کہ احادیث میں وارد ہے۔ جو آخرت کا غم لگائے رکھے خدا اس کے سارے غموں کے لئے کفایت کرتے ہیں۔ یہ بات کثرت ذکر سے پیدا ہوتی ہے کہ ذکر کی بھوک و پیاس لگی رہے۔ اور ذکر اس کی خوراک بن جائے۔ جیسے ملائکۃ اللہ کی تسبیح باری تعالیٰ اور تقدیس غذا ہے۔ بندہ بھی اگر اخلاص سے چلے اور محنت کرے تو باری تعالیٰ یہ بات نصیب فرماتے ہیں۔ ہمارے حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب رائپوری رحمۃ اللہ علیہ فقط چائے کی ایک فنجان پر روزہ رکھتے تھے اور سارا دن قرآن شریف پڑھتے رہتے۔ حتیٰ کہ روزانہ کا قرآن شریف ختم کرنا معمول تھا۔ حضرت رائے پوری یعنی شاہ عبدالقادر صاحب فرماتے ہیں کہ میں نے ایک دن جرأت کر کے دریافت کیا کہ حضرت اتنی تو گرمی کے روزے ہیں اور آپ فقط ایک فنجان پر کفایت کرتے ہیں فرمایا کہ الحمدللہ جنت کا ذائقہ آرہا ہے۔ میں نے حضرت شاہ

عبدالرحیم رائے پوری کی بھی زیارت کی ہے۔ ہمارے حضرت رائے پوری یعنی شاہ عبدالقادرؒ چونکہ حضرت شاہ صاحبؒ کے شاگرد تھے۔ حضرت شاہ عبدالرحیم رائے پوری کو بھی حضرت شاہ صاحب سے بھی بڑی محبت تھی اکثر دیوبند تشریف لے جاتے تھے۔ اور حضرت شاہ صاحب بھی رائے پور زیارت کے لئے تشریف لاتے تھے۔ ایک دفعہ حضرت رائے پوری حضرت شاہ عبدالرحیم رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ میں نے یہ سفر دیوبند کا اس لئے کیا ہے کہ مولانا محمد انور شاہ کو دارالعلوم دیوبند کا رکن بنانا ہے۔ حضرت شیخ الہندؒ سے بھی بڑی ہی محبت تھی۔ حضرت شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضرت نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ کا دسترخوان بہت وسیع تھا۔ حضرت خود کچھ نہیں تناول فرماتے تھے۔ ایک دفعہ شوربے کے پیالے کی طرف ہاتھ بڑھایا اور پھر لقمہ منہ میں نہیں ڈالا تا آنکہ دسترخوان اٹھالیا گیا۔ پھر رات بھر کے جاگنے کا معمول تھا۔ دیوبند بزرگوں میں یہ مشہور تھا کہ حضرت شاہ صاحب "جب نماز پڑھتے ہیں تو ٹھیک بندہ بن کر کھڑے ہوتے ہیں۔ اور حضرت شاہ صاحب کا تقویٰ بہت ہی بڑھا ہوا تھا۔ ہمارے ایک استاد تھے حضرت مولانا مفتی فقیر اللہ صاحبؒ وہ فرماتے تھے کہ حضرت شاہ صاحب کو دیکھ کر خدا تعالیٰ یاد آتا ہے۔ یہی اولیاء اللہ کی نشانی ہے۔ جیسا کہ روایات میں حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے متعلق نماز پڑھنا ثابت ہے۔ کم از کم میں نے تو اپنی ساری عمر میں حضرت شاہ صاحبؒ جیسا نماز پڑھنے والا کوئی نہیں دیکھا۔ حضرتؒ کے چہرہ پاک سے یوں محسوس ہوتا تھا کہ ان کو اللہ تعالیٰ کی خشیت بہت ہے۔ "اَلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَکَانُوۡا یَتَّقُوۡنَ" اولیاء اللہ کے متعلق قرآن پاک میں فرمایا۔

مزاح و اسلام ایچوں کی دعوات اور پیار

بعض اوقات سبق کے ضمن میں طلباء کا دل بہلانے کے لئے کوئی بات ظرافت کی کہہ دیتے تھے۔ ایک دفعہ بخاری شریف کے درس میں قصہ سنایا کہ دیوبند میں ایک شاعر صاحب تھے۔ وہ فرماتے تھے کہ ہم بھی تصوف پر شعر کہتے ہیں۔ مثلاً

ٹوپی	و	اُسترا	والا	مرزا
تمام	تیرے	شوق	میں	کنگھیر لایا ساتھ

کسی نے کہا کہ شعر تو آپ نے خوب سنایا مگر اس میں تصوف کی کون سی بات ہے۔ دوسرے آدمی نے کہا کہ اجی اس میں الف لام تو تصوف کا ہے۔ اس پر حضرت شاہ صاحبؒ بہت مسکراتے

تھے۔ پھر فرمایا کہ میں کہتا ہوں کہ پہلے مصرع میں قضا بھی ہونا چاہیے۔ یعنی۔ آنچہ وانمیر اولا حترا قضاء۔ تا کہ وزن درست رہے۔ پھر وہ شاعر صاحب فرمانے لگے کہ میں کیا شاعر ہوں۔ مجھ سے تو بچارہ ذوق ہی اچھا تھا۔ اس پر بہت مسکراتے تھے۔ آپ کی نظمیں بہت ہیں۔ بہت سے قصائد عربی و فارسی ہیں۔ بعض نظمیں ایسی ہیں جن کا ایک مصرع فارسی اور ایک عربی ہے۔ عموماً اشتیاقیہ نظمیں بہت ہیں۔ جو اکثر مدینہ شریف کے رستہ میں کہی ہیں۔ کئی نظموں کا اور قصائد کا مجموعہ ہمارے پاس بھی ہے۔ جو اگر موقع ملا تو شائع کیا جائے گا۔ ان شاء اللہ آگے جو اللہ کو منظور ہوگا۔

فرماتے تھے کہ میں نے شعروں پر کبھی وقت ضائع نہیں کیا جب کھانے پر بیٹھتا تھا تو پنسل اور کاغذ اپنے پاس رکھتا تھا۔ اور لقمہ کھایا اور ایک شعر کہہ لیا لکھ لیا۔ پس ادھر کھانا ختم ہوا ادھر اشعار ختم ہوئے۔ مقامات حریری کی طرز پر آپ کی ایک کتاب تھی جس میں کئی ایک مقالے بے نقط تھے۔

ایک دفعہ احقر حضرت کی زیارت کے لئے حضرت کے کمرہ میں بیٹھا تھا کہ اتنے میں حضرت مفتی عزیز الرحمن صاحبؒ تشریف لائے۔ اور دروازے پر کھڑے ہو کر ایک مسئلہ حضرت شاہ صاحبؒ سے دریافت فرماتے تھے۔ حضرتؒ نے فرمایا کہ میں خود ہی حاضر ہو جاتا۔ حضرت آپ نے کیوں تکلیف فرمائی۔ فرمایا کہ نہیں۔ مجھے ہی آنا چاہیے تھا۔ اس طرح حضرت مفتی صاحب کئی بار تشریف لا کر مسائل کی تحقیق کیا کرتے تھے۔ یہ حضرت مفتی صاحب ہمارے بھی ابن ماجہ شریف اور طحاوی شریف اور موطا امام محمد وغیرہ میں استاذ ہیں۔ ان کو اجازت حضرت مولانا فضل الرحمن صاحب گنج مراد آبادیؒ سے ہے۔ اور ان کو اجازت حضرت شاہ عبد العزیزؒ سے ہے۔ حضرت مفتی صاحب نے ہم کو اپنی اس سند کی بھی اجازت دی تھی۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ ایک بار حضرت شاہ اہل اللہ صاحبؒ جو کہ برادر تھے حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلویؒ کے اپنے حجرے میں بیٹھے تھے کہ ایک سپاہی آیا کہ آپ کو بادشاہ سلامت نے بلایا ہے۔ حضرت شاہ صاحب فوراً اٹھے اور اس سپاہی کے ساتھ چل دیے۔ وہ سپاہی بجائے لال قلعہ جانے کے دہلی سے باہر پہاڑ گنج کی طرف گیا۔ وہاں جا کر ایک غار کے پاس کھڑے ہو کر کہنے لگا کہ اس غار میں داخل ہو۔ جب شاہ صاحب اس غار میں داخل ہوئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ جنات کا ایک بہت بڑا مجمع ہے اور جنات کا بادشاہ بیٹھا ہے۔ اور اس کے دائیں جانب ایک بہت بوڑھا جن بیٹھا ہے۔ اور بادشاہ کے سامنے ایک مردہ لٹایا ہوا ہے۔ اور ایک مرد اور ایک عورت وہاں کھڑے ہیں۔ انہوں نے شاہ صاحبؒ کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ اس آدمی نے ہمارے اس بیٹے کو قتل کر دیا ہے ہمیں قصاص دلوانا چاہیے۔ حضرت شاہ اہل اللہ صاحبؒ نے فرمایا کہ تم

لوگ مجھ سے قصاص نہیں لے سکتے۔ کیونکہ حدیث میں آتا ہے کہ جس شخص نے اپنی پوشش بدل دی اگر اس کو کوئی موزی غلط فہمی سے مار ڈالے تو اس مارنے والے سے قصاص نہیں لے سکتے۔ بادشاہ نے اس جن سے جو اس کے دائیں جانب بیٹھا تھا پوچھا کہ کیا یہ حدیث ہے۔ تو اس نے کہا کہ ہاں یہ حدیث ہی ہے۔ جب حضور نے یہ حدیث فرمائی تھی تو میں اس وقت دربار میں حاضر تھا۔ میں نے اپنے کانوں سے اس حدیث کو سنا ہے۔ حضرت شاہ اہل اللہ صاحب فرماتے ہیں کہ بادشاہ نے پھر مجھے یہ حدیث سن کر رہا کر دیا۔ اور مجھ سے قصاص نہیں لیا مجھ کو اپنے رہا ہونے کی اتنی خوشی نہیں ہوئی جتنی خوشی کہ مجھے اس صحابی جن کے دیکھنے سے ہوئی۔ پھر شاہ اہل اللہ صاحب نے ان صحابیؓ سے وہی حدیث سنی اور تابعی ہو کر واپس آئے۔ یہ قصہ میں حدیث ترمذی شریف کے درس میں حضرت شاہ صاحبؒ نے سنائی تھی۔ اس جن کا نام شاھورشؓ تھا۔ یہ واقعہ ۱۳۴۸ھ کا ہے۔ ظفر (یعنی بہادر شاہ دلی کے بادشاہ) کے اس شعر کو بہت پسند کرتے تھے۔

ظفر آدمی اس کو نہ جانیے گا، گو ہو کیسا ہی صاحب فہم و ذکا
جسے عیش میں یاد خدا نہ رہی جسے طیش میں خوف خدا نہ رہا

جب مولانا عاشق الٰہی صاحب میرٹھی نے جمع الفوائد کے شائع کرنے کا ارادہ فرمایا تو میرٹھ میں بہت سے حضرات کا اجتماع کیا۔ حضرت تھانویؒ بھی تھانہ بھون سے تشریف لے گئے۔ حضرت سہارن پوری بھی سب کے سب حاضر تھے۔ دیوبند سے بھی حضرت شاہ صاحبؒ اور مفتی عزیز الرحمٰن صاحبؒ اور مولانا شبیر احمد صاحبؒ تھے۔ سب نے تجویز کیا کہ حضرت شاہ صاحبؒ ابتدا کریں۔ تو حضرت شاہ صاحب نے یہ آیت مبارک فلکڑی کہ اسے ناپ کر کے دکھاؤ "انا فتحنا لک فتحا مبینا" مولانا عاشق الٰہی صاحبؒ نے دمشق جا کر حضرت مولانا بدرالدین محدثؒ کے فرمانے پر دمشق سے ستر (۷۰) میل ایک گاؤں میں جا کر یہ کتاب یعنی جمع الفوائد حاصل کی اور بڑی کوشش سے ہندوستان لائے۔ پھر بڑے ہی اہتمام سے اس کتاب کو شائع کیا۔ اس کتاب میں حدیث کی چودہ (۱۴) کتابوں کی حدیثیں جمع ہیں۔ حضرت تھانویؒ فرماتے تھے کہ میں نے اپنا سارا کتب خانہ مدرسے کی ملک کر دیا تھا۔ مگر یہ کتاب اپنے پاس رکھی تھی۔ حضرت مولانا عاشق الٰہی صحیح معنوں میں عاشق الٰہی تھے۔

اسلامی جہاد

ڈاکٹر حمید اللہ مرحوم

انبیاء سلف علیہم السلام کے حالات کا ہمیں بہت کم علم ہے۔ قرآن مجید میں مثلاً حضرت آدم اور ادریس و نوح کی حد تک کسی جنگی تبلیغ کا پتہ نہیں چلتا، اور شاید چلنا بھی نہیں چاہیے، کہ یہ انبیاء اپنے خاندان یا قبیلے ہی کی اصلاح چاہتے تھے، اور ان کے نیز بعد کے زمانے میں نافرمان خدائی عذاب اور آفات سماوی کا شکار ہو کر کیفر کردار کو پہنچتے رہے۔ ابراہیم و موسیٰ مایوسی کے عالم میں محض ہجرت کرتے ہیں۔ انہوں نے بھی تبلیغ کی کشمکش میں شمشیر کی صورت نہ دیکھی، عملی اور حقیقت پسندانہ نقطہ نظر سے جانچو تو ان انبیاء کو ایسے پیروی نہ ملے جو مخالفوں سے کشمکش میں سینہ سپر ہو سکیں، حضرت موسیٰ کے نافرمان ساتھی تو ((اذہب انت وربک فقاتلا)) کا ضرب المثل جملہ کہنے سے باک نہ کرتے تھے، بظاہر جس واحد نبی کو ہم قرآنی شہادت میں قتال فی سبیل اللہ کرتے دیکھتے ہیں، وہ حضرت اشمویل ہیں جن کا ذکر پارہ سیقول کے آخر میں ہے، ان سے بنی اسرائیل کہتے ہیں:۔

”ہمارے لئے ایک بادشاہ برپا کر، تاکہ ہم اللہ کی راہ میں لڑیں، اور اللہ کی راہ میں ہم کیوں نہ لڑینگے، جبکہ ہمیں اپنے گھروں اور بال بچوں سے نکال باہر کیا ہے۔“

اسے زیادہ سے زیادہ انتقامی اور دفاعی جنگ کہہ سکتے ہیں، وہ بے غرضانہ اور بے نفسانہ جنگ جس کا منشاء نہ اہل وعیال ہو نہ مال و منال اور نہ ہی شہرت یا حمیت، بلکہ صرف اعلاء کلمۃ اللہ یا ایثار جس میں جان، مال، آبرو ہر چیز اللہ کے لئے اور اللہ کے حکم سے قربان کر دی جائے، اس کا پتہ رسول عربی سے پہلے نہیں چلتا۔

انسانی تاریخ جنگوں سے بھری ہوئی ہے، لیکن وہ جنگ جس کا مقصد نہ جہانگیری ہو اور نہ

اقتدار کی ہوس، یہ دل گردہ چاہتی ہے، رسول اکرم نے صرف ایک جنگ کی اجازت دی، وہ اللہ کی راہ میں ہو، کسی صحابی نے پوچھا:

﴿من فی سبیل اللہ؟ قال من قاتل لتکون کلمۃ اللہ ھی العلیا﴾

"اللہ کی راہ میں کون ہے؟ فرمایا صرف وہ جو اس لئے لڑائی کرے کہ اللہ ہی کا بول بالا ہو۔

یہ صحیح ہے کہ حضرت عیسیٰ کی تعلیم جو مروجہ انجیل میں ملتی ہے، وہ انسانی مظلومیت کا اعلیٰ نمونہ ہے کہ ایک گال پر بے قصور طمانچہ مارنے والے کو دوسرا گال پیش کر دو، لیکن اگر وہ حضرت داؤد یا سلیمان کے جانشین ہوئے ہوتے تو کیا کرتے؟

زمانہ حال میں بھی بعض "بزرگ" عدم تشدد کا پرچار کرتے رہے، لیکن صرف اس وقت تک جب تک قوی تر سے مقابلہ تھا، اور ہاتھ میں فوج اور ہتھیار نہ تھے، اللہ کی راہ میں لڑائی یہ نہیں ہے کہ کمزور کو حریف دیکھ کر جی للچائے اور اسے دبوچ لیں، بھیڑیا بھی یہی کرتا ہے۔

رسول عربی ﷺ کا قول وفعل:۔

اسلام نے اپنے پیروں پر جہاد فرض کیا ہے، اس اصطلاح کے لفظی معنی کشمکش کے ہیں، جو بہت وسیع مفہوم ہے اور جس میں بزور بازو اصلاح کرنا، زبان سے کلمہ حق کہنا، بے بسی کے عالم میں کم از کم دل ہی سے برائی کو برائی سمجھنا، سب داخل ہیں، ہر چیز کا وقت ہوتا ہے اور ہر شخص کو موقع وحالات کے لحاظ سے کبھی کچھ اور کبھی کچھ کئے بغیر چارہ بھی نہیں، آدمی حقیقت پسند نہ ہو تو مقصد کو حاصل بھی نہ کر سکے۔

رسول ﷺ اکرم کے پیروں کو ہجرت سے قبل مکہ میں کیا کچھ اذیت نہ دی گئی، اور جیسے جیسے یہ ہجرت کرتے جاتے تھے، ان کی جائیداد منقولہ وغیر منقولہ قرق ہوتی گئی، جب خود آنحضرت ﷺ ہجرت فرماتے ہیں تو آپ ﷺ کے پاس جو کثیر رقمیں امانت تھیں، ان کو آپ انتقاماً ساتھ لے کر مدینہ "فرار" ہو سکتے تھے، مگر آپ ﷺ نے جو کیا اس سے خود بیسویں صدی کے "مہذب" انسان کو (چاہے گورا ہو یا کالا) شرمانا پڑتا ہے!

آپ ﷺ بدر میں تشریف فرما ہیں، ابو جہل کی سرداری میں تعداد میں تین گنا، ساز و سامان میں دس گنا دشمن لشکر چڑھائی کرتا ہے۔ مورخ بلاذری نے "انساب الاشراف" میں ایک کم معروف مگر اہم تفصیل درج کی ہے، اور لکھا ہے:

"آنحضرت ﷺ نے قریش کے لشکر کو کہلا بھیجا کہ وہ واپس چلے جائیں، کیونکہ آپ ان سے لڑنا نہیں چاہتے تھے۔ جب ادھر سے انکار ہوا تو مجبوراً لڑائی کرنی ہی پڑی۔ ہتھے دشمن کو شکست فاش دینے کے بعد جب ستر ای آدمی گرفتار ہوئے تو ان سب کو تلوار کے گھاٹ اتارنے میں کوئی امر مانع نہ تھا، اور شاید مسلمان حق بجانب بھی ہوتے، مگر مقصد نہ انتقام تھا اور نہ درندگی و خونخواری، اگر ان سب کو یونہی چھوڑ دیا جاتا تو شاید وہ بھی افراد کی فطرتوں میں تفاوت کے باعث مقصد کو فوت کر دیتا، اس لئے قیدیوں سے برتاؤ بھی مختلف رہا، شریفوں کو محض اس وعدے پر چھوڑ دیا کہ آئندہ آپ ﷺ کے خلاف ہتھیار نہ اٹھائیں گے، اسلحہ فروش مالداروں سے فدیہ میں ہتھیار مانگے گئے، سرمایہ داروں سے رقم مانگی گئی، پڑھے لکھوں سے کہا گیا کہ ہر شخص دس دس مسلمان بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھائے، صرف دو قیدیوں کو جو بدر کی چڑھائی کے اصل ذمہ دار تھے اور ہر طرح کے جبر اور طنز وغیرہ کے ذریعے سے پہنچانے والوں کو بھی ورغلا کر لائے تھے، اور جن کی افتاد طبع سے اس کی توقع ہی نہ تھی کہ کسی نرمی یا رعایت سے وہ کچھ بھی متاثر ہوں گے، صرف ایسے دو آدمیوں کو مستقبل کے خوف سے سزائے موت دی گئی۔"

بنو النضیر کے یہودیوں نے بد عہدی سے گزر کر غداری کا قدم اٹھایا تھا، آنحضرت ﷺ کو انہوں نے ہجرت پر راضی خوشی اپنی شہری مملکت کا سردار تسلیم کیا تھا، لیکن جب ایک مرتبہ آپ ﷺ ان کے محلے میں گئے اور دھوپ سے بچنے کے لئے ایک برج کے سائے میں تشریف فرما ہوئے، (ان اللہ کے بندوں کو اس کی بھی توفیق نہ ہوئی تھی کہ اپنے صدر مملکت کو کسی گھر میں بٹھا کر گفتگو کریں) تو برج پر سے ایک بڑا پتھر گرا کر آپ کو قتل کرنے کی تدبیر ہوئی، جب ہر طرح کی سرزوری اور جنگی مقاومت کے باوجود ان کو صرف یہ سزا ملی کہ کہیں اور چلے جائیں (اور پورا مال و متاع ساتھ لے کر جائیں حتیٰ کہ

مسلمانوں کو دیے ہوئے قرضے بھی واپس حاصل کر لیں) تو اس رعایت کا بدلہ یوں دیا کہ سارے عرب کو مدینے پر چڑھا لائے اور معرکۂ خندق میں مسلمانوں کے "پیچھے منہ کو آ گئے" اس انتہائی نازک اور زندگی و موت کی کشمکش میں اندرون مدینہ کے بنو قریظہ نے تین دم آشفتہ داری کی اور چاہا کہ مسلمانوں پر اندر سے ٹوٹ پڑیں (اور خندق وغیرہ کا سارا دفاعی نظام بیکار کر دیں) انہیں بڑی فراست سے ایک دن روکا گیا، دوسرے دن یوم سبت (سنیچر) تھا جس میں یہودی اس زمانے میں جنگ نہ کرتے تھے، تیسرے دن عربوں کے حرام مہینے (ذیقعدہ تا محرم) شروع ہو رہے تھے، اس طرح لڑائی ختم ہو گئی۔

پروفیسر ونسنک نے (جو غالباً یہودی تھا) یہ معقول سوال کیا ہے کہ بنو النضیر کے ساتھ رعایت کے تلخ تجربوں کے بعد کیا بنو قریظہ کی قوت بھی انہی مخالفوں کی طاقت میں اضافے کے لئے چھوڑ دی جا سکتی ہے؟ مگر آنحضرت ﷺ نے پھر بھی نرمی دکھائی، اور فرمایا کہ:

"ان پر یہودیوں ہی کے ایک سابق دوست اور حلیف کو پنچ ٹھہرایا جائے اور وہ جو بھی فیصلہ کرے وہ نافذ کیا جائے۔"

اگر بنو قریظہ خود آنحضرت ﷺ کو حکم بناتے تو شاید "رحمۃ للعالمین" کا مظاہرہ ہوتا، بہر حال اس پنچ نے بھی کوئی خاص سختی نہ کی اور صرف یہ حکم دیا کہ:

"توریت میں حضرت موسیٰ کو مغلوب دشمن سے برتاؤ کا جو حکم دیا گیا ہے، (دیکھو توریت کتاب تثنیہ Deutronomy فصل ۲۰ فقرہ ۱۰ تا ۱۴) وہی عمل میں لایا جائے۔"

گویا یہودی اپنے دشمنوں سے جو برتاؤ کرتے ہیں، وہی برتاؤ ان سے کیا جائے۔

فتح مکہ شاید انسانی جہاد کا کمال ہے، اکیس سال سے مسلسل اہل مکہ مسلمانوں کو روز افزوں بے حد ستاتے چلے آ رہے تھے، اس کی داستان سے سب واقف ہیں، جب آنحضرت ﷺ اپنے وطن کو، جہاں سے جلا وطنی پر آپ کو مجبور کیا گیا تھا، فاتحانہ واپس آئے تو جو برتاؤ عمل میں آیا، اس کا بیسویں صدی کا "مہذب" انسان تصور بھی نہیں کر سکتا، فوجی دستے شہر کی طرف بڑھے تو اس منادی کے ساتھ کہ:

''جو اپنے گھر میں بیٹھ رہے اسے امان ہے، جو ہتھیار ڈال دے اسے امان ہے، جو حرم کعبہ میں چلا جائے اسے امان ہے، جو سردار شہر ابوسفیان کے گھر میں چلا جائے اسے امان ہے۔''

شہر پر قبضہ مکمل ہو جانے کے بعد بستی کی ساری آبادی بلائی گئی اور آنحضرت ﷺ نے اس سے پوچھا کہ وہ کس برتاؤ کی توقع کرتی ہے؟ آنحضرت ﷺ سب کے قتل عام کا حکم دے سکتے تھے، ساری جائیداد لوٹ لے سکتے تھے، سارے لوگوں کو غلام بنانے کا بھی فیصلہ فرما سکتے تھے، مگر آپ ﷺ نے صرف یہ فرمایا کہ:

''جاؤ تم پر کوئی گرفت نہیں، تمہیں چھوڑ دیا جاتا ہے۔''

اس نفسیاتی لمحہ میں فوراً ہی بکثرت لوگ مسلمان ہو گئے۔ ان میں سب سے پہلے ایک مشہور متمرد سردار عتاب تھا آنحضرت ﷺ کے اس ارشاد سے چند لمحہ پہلے جب حضرت بلالؓ نے کعبہ کی چھت پر چڑھ کر اذان دی تو عتاب نے کہا تھا:

''خدا کا شکر ہے کہ میرا باپ آج زندہ نہیں ہے ورنہ وہ اس کبیخ حمار (یعنی حضرت بلالؓ کی اذان) کو برداشت نہ کر سکتا۔''

جب عفو عام کے اعلان پر سب سے پہلے عتاب نے آگے بڑھ کر اپنا تعارف کرایا اور اپنے اسلام کا اعلان کیا تو اس کے جواب میں آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

''اچھا میں تمہیں مکہ کا گورنر مامور کرتا ہوں۔''

تو مفتوحہ شہر وہیں کے ایک نو مسلم کٹر دشمن کے سپرد کر دیا جاتا ہے اور چند دن بعد مدینہ واپسی ہوتی ہے تو مدینہ کا ایک واحد سپاہی تک وہاں احتیاطاً چھوڑنا غیر ضروری خیال کیا جاتا ہے۔

﴿ولمثل هذا فليعمل العاملون﴾

''طاقت کے وقت نرمی، کمزوری کے وقت ہمت و ایثار، یہ ہے اسلامی جہاد!

حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا کی سیرت پاک کا ایک صفحہ

آپ کا مشہور نام فاطمہؓ آپ کی والدہ کا نام حضرت خدیجہ ہے۔ اور آپ رسول پاک کی سب سے پیاری بیٹی ہیں۔

آپ زاکیہ، طاہرہ، مطہرہ، راضیہ، مرضیہ اور بتول کے نام سے بھی مشہور ہوئیں۔ فاطمہ آپ کا نام اس وجہ سے ہے کہ اللہ نے آپ پر دوزخ کی آگ کو حرام کیا ہے۔ حضرت فاطمہؓ چونکہ بہت خوبصورت تھیں۔ اس لئے آپ کا لقب زہرہ پڑ گیا۔

بتول آپ کو اس لئے کہتے ہیں کہ آپ کی طبیعت میں بچپن ہی سے سادگی تھی۔ آپ کا دل کھیل کود میں نہیں لگتا تھا۔ اور نہ آپ کہیں آتی جاتی تھیں۔ بلکہ اپنی والدہ حضرت خدیجہ کے پاس بیٹھی رہتی تھیں۔ رسول پاک ﷺ کو حضرت فاطمہ کی یہ عادتیں بہت پسند تھیں۔ اسی لئے آپ بتول (دنیا کی چھوڑ دینے والی) کے نام سے یاد فرمائی جاتی تھیں۔ اور چونکہ اپنی عادت واطوار سیرت وصورت میں حضرت فاطمہ حضرت پاک ﷺ سے بہت ملتی جلتی تھیں۔ اسی لئے آپ زاکیہ اور راضیہ کے نام سے مشہور ہوئیں۔

حضرت فاطمہ زہراؓ کی پیدائش:۔

حضرت فاطمہؓ رسول پاک ﷺ کے نبی ہونے سے پانچ سال پہلے پیدا ہوئیں۔ یہ وہ مبارک زمانہ تھا۔ جب قریش خانہ کعبہ (خدا کے گھر) کو نئے سرے سے بنا رہے تھے۔ حضرت خدیجہؓ کی اولاد میں حضرت فاطمہؓ سب سے چھوٹی تھیں ان سے پہلے حضرت زینبؓ، حضرت رقیہؓ، حضرت ام کلثومؓ پیدا ہو چکی تھیں۔ ان سب کے بعد حضرت فاطمہؓ پیدا ہوئیں ابھی حضرت فاطمہؓ بچی ہی تھیں کہ آپ کے سر سے آپ کی والدہ حضرت خدیجہؓ کا سایہ اُٹھ گیا۔

ہجرت اور نکاح:۔

ہمارے رسول پاک ﷺ جب کافروں کے ظلم وستم سے تنگ آ کر خدا کے حکم سے مکہ سے مدینہ منورہ تشریف لے گئے تو مدینہ پہنچ کر کچھ دنوں کے بعد آپ نے اپنے سب گھر والوں کو بھی مدینہ منورہ بلا لیا تھا۔اس لئے آپ بھی مدینہ منورہ چلی آئیں تھیں۔سب سے پہلے حضرت ابو بکر صدیقؓ نے رسول پاک ﷺ کو حضرت فاطمہؓ سے نکاح کا پیغام دیا۔لیکن رسول ﷺ نے کچھ جواب نہیں دیا۔پھر حضرت عمرؓ نے رسول پاک ﷺ سے عقد کی استدعا کی۔لیکن آپ خاموش ہو رہے۔پھر حضرت علیؓ رسول پاک ﷺ کے پاس اس غرض سے حاضر ہوئے اور عقد کی درخواست کی۔رسول پاک ﷺ نے فرمایا تمھارے پاس کچھ مہر ادا کرنے کے لئے بھی ہے؟ حضرت علیؓ نے عرض کیا کہ ایک گھوڑے اور زرہ کے سوا کچھ نہیں رسول پاک ﷺ نے ارشاد فرمایا گھوڑا تو لڑائی کے لئے ہے مگر زرہ فروخت کر ڈالو۔رسول پاک ﷺ کے ارشاد کے موافق حضرت علیؓ نے اس زرہ کو حضرت عثمانؓ کے ہاتھ چار سو اسی درہم میں بیچا اور اس کی قیمت لا کر رسول پاک ﷺ کے سامنے پیش کی۔رسول پاک ﷺ نے حضرت بلالؓ کو حکم دیا کہ بازار سے عطر اور خوشبو کی چیزیں خرید لاؤ۔اور حضرت انسؓ کو حکم دیا کہ جاؤ ابو بکرؓ،عمرؓ،طلحہؓ، زبیرؓ اور انصار کو بلا لاؤ۔جب سب لوگ جمع ہو گئے تو آپ گھر میں تشریف لے گئے۔اور حضرت فاطمہؓ کی مرضی دریافت کی۔حضرت فاطمہؓ یہ سن کر شرم کی وجہ سے چپ ہو گئیں۔جس سے رسول پاک ﷺ نے ان کی مرضی کو پا لیا۔اور مسجد میں آ کر حضرت علیؓ سے حضرت فاطمہؓ کا نکاح خدا کے حکم سے پڑھایا اور ۴۰۰ سو مثقال چاندی جس کے تقریباً ایک سو پچاس) روپیہ کلدار ہوتے ہیں۔مہر مقرر فرمایا۔حضرت فاطمہؓ کا نکاح ہجرت کے دوسرے سال حضرت عائشہؓ کی رخصتی کے تقریباً 4/1/2 مہینے بعد ہوا۔

نکاح ہو چکنے کے بعد حضرت فاطمہؓ اپنے گھر کی جدائی کے خیال سے رو رہی تھیں۔کہ اتنے میں رسول پاک ﷺ گھر تشریف لائے۔آپ نے حضرت فاطمہؓ کو روتے ہوئے دیکھ کر فرمایا۔بیٹی تم کیوں روتی ہو۔میں نے تمھاری شادی ایک ایسے آدمی سے کی ہے جو علم اور بردباری میں سب سے بہتر

ہے اور اسلام لانے میں بہت بہتر ہے۔

حضرت فاطمہؓ کی رخصتی :۔

نکاح ہونے کے تقریباً نو گیارہ مہینے کے بعد حضرت فاطمہؓ کی رخصتی ہوئی۔ حضرت علیؓ نے رسول پاک ﷺ کے مکان سے کچھ دور ایک چھوٹا سا گھر کرایہ پر لے لیا تھا۔ اس میں رہتے تھے۔ حضرت علیؓ حضرت فاطمہؓ کو اسی گھر میں رخصت کرا کر لائے۔ رسول پاک ﷺ اپنی صاحبزادی حضرت فاطمہؓ کو رخصت کرتے وقت اپنی باندی حضرت ام ایمن کو ان کے ساتھ کر دیا۔ حضرت علیؓ سے فرمایا کہ تم میرا انتظار کرنا دوسرے روز رسول پاک ﷺ حضرت علیؓ کے گھر تشریف لے گئے۔ اور دروازہ کھلوایا۔ رسول پاک ﷺ نے ان کے لئے برکت کی دعا فرمائی۔ پھر آپ اندر تشریف لے گئے اور ایک برتن میں پانی منگایا اور اس میں تھوڑا سا پانی پی کر حضرت علیؓ کو پلایا اور بچے ہوئے پانی سے تھوڑا سا پانی ان کو پلا کر وہی پانی کے بیٹے دونوں مونڈھوں اور بازوں پر چھڑکا۔ اور فرمایا! فاطمہؓ میں نے تمہاری شادی اپنے خاندان کے بہترین آدمی سے کی ہے۔

حضرت فاطمہؓ کا جہیز :۔

رسول پاک ﷺ نے اپنی صاحبزادی حضرت فاطمہ زہراؓ کو جہیز میں ایک تخت۔ ایک چادر، ایک بستر، جس میں کھجور کی چھال بھری ہوئی تھی۔ دو چکیاں اور ایک مشکیزہ اور دو مٹی کے گھڑے دیئے اور عجیب بات یہ ہے کہ حضرت فاطمہؓ کے گھر کے سامان میں ساری عمر اس سے زیادہ اور کوئی چیز نہ بڑھ سکی۔

دعوت ولیمہ :۔

رسول پاک ﷺ نے حضرت علیؓ سے ارشاد فرمایا کہ ولیمہ کی دعوت بھی کی جائے زہد فقر کے بادشاہ حضرت علیؓ نے اسی رقم سے جو مہر کے ادا ہونے کے بعد بچ رہی تھی ولیمہ کی دعوت کی دسترخوان پر صرف کھجور جو کی روٹی پنیر اور ایک خاص قسم کا شوربہ تھا۔

حضرت اسماء کا بیان ہے کہ اس زمانہ میں اس سے بہتر ولیمہ نہیں ہوا۔

حضرت فاطمہؓ کا گھر:۔

حضرت فاطمہؓ کے گھر کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ حضرت علیؓ بیان فرماتے ہیں کہ جب میری شادی حضرت فاطمہؓ سے ہوئی۔ تو میرے گھر میں کوئی بچھونا نہ تھا میرے پاس مینڈھے کی ایک کھال تھی رات کو میں اس کھال پر لیٹ رہتا تھا۔ اور نہ میرے گھر میں گھر کا کام کاج کرنے کے لئے نوکر تھا۔

حضرت فاطمہؓ کا گھر دور ہونے کی وجہ سے رسول پاک ﷺ کو وہاں جانے کی تکلیف کی وجہ سے ایک دن رسول پاک ﷺ نے حضرت فاطمہؓ سے فرمایا! پیاری بیٹی میں تمہیں چاہتا ہوں کہ تم میرے کے پاس رہو۔ حضرت فاطمہؓ نے عرض کیا۔ کہ ابا جان اگر آپ حارث بن نعمانؓ کے کئی گھر آپ کے مکان کے قریب ہیں۔ اگر آپ حارث بن نعمانؓ سے فرمادیں تو وہ اپنا کوئی نہ کوئی گھر میرے لئے خالی کردیں گے۔

رسول پاک ﷺ نے فرمایا مجھے ان سے کہتے ہوئے شرم آتی ہے جب رسول پاک ﷺ کی یہ بات حارث بن نعمانؓ کو پہنچی تو انہوں نے رسول پاک ﷺ سے عرض کیا کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ حضرت فاطمہؓ کو اپنے قریب کے کسی مکان میں بلا لینا چاہتے ہیں۔ میرے سارے گھر آپ کے لئے ہیں۔ آپ جس گھر میں چاہیں حضرت فاطمہؓ کو بلا لیجئے۔ میری جان و مال اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے لئے ہے۔ خدا کی قسم میرا وہ مال جو آپ کے کام آئے مجھے زیادہ وہ پیارا معلوم ہوتا ہے۔ رسول پاک ﷺ نے فرمایا۔ تم نے سچ کہا اور ان کے لئے برکت و رحمت کی دعا کی۔ پھر حضرت فاطمہؓ کو حارث بن نعمانؓ کے مکان میں بلا لیا۔ جو رسول پاک کے مکان سے ملا ہوا تھا۔

زمرؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول پاک نے گھر کا کام دھندا اپنی صاحبزادی حضرت فاطمہؓ کے ذمہ کیا۔ اور باہر کے انتظامات حضرت علیؓ کے سپرد کئے۔

درود پڑھ کر سلام لکھئے

(صوفی فقیر محمد)

قلم اٹھا کر درود پڑھیے — قلم جھکا کر سلام لکھیے
حضور ﷺ کی شان کے مناسب — ادب سے موزوں کلام لکھیے
انہیں کی عظمت تمام لکھیے — انہیں کی مدحت مدام لکھیے
خدا کے بعد ان کا نام لے کر — خدا کے بعد ان کا نام لکھیے
ثنا بصد اہتمام لکھیے! — ثنا بصد التزام لکھیے
ثنا بصد احترام لکھیے — ثنائے خیر الانام لکھیے
انہیں رسولوں کا تاج کہیے! — تو انبیاء کا امام لکھیے
بلند منصب ہے ان کا سب سے — انہیں کا اونچا مقام لکھیے
حدیث لولاک شان ان کی — ہے سیر افلاک شان ان کی
مقام محمود ان کو حاصل — انہیں کو حاصل دوام لکھیے
رسول رحمت ہے نام ان کا — کہ بس شفاعت ہے کام ان کا
انہیں کی ہے آخری ہدایت — انہیں کی ہے دائمی شریعت
جو وہ کہیں وہ حلال کہیے! — جو وہ کہیں وہ حرام لکھیے!
سوال میں اعتدال اچھا! — کہ مختصر ہے سوال اچھا
بس ایک لکھیے نظر کرم کی — بس ایک کوثر کا جام لکھیے
سنبھل سنبھل کر کلام کیجئے! — بچا بچا کر کلام لکھیے!
نماز پر بھی ہے ناز بہتر! — مگر ہے صوفی نیاز بہتر!
نماز پڑھ کر درود پڑھیے! — درود پڑھ کر سلام لکھیے

روضہ اقدس پر حاضری کے وقت آپ کے یہ مرتبے اللہ اکبر یا نبی صلی اللہ علیہ وسلم

آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں رحمت کے بے پایاں سمندر یا نبی
آپ صلی اللہ علیہ وسلم میں سب حسن و خوبی کے ہیں گوہر یا نبی
آپ صلی اللہ علیہ وسلم جب بھی ہوتے ہوں گے زیب منبر یا نبی
وہ طلوع مہر جیسا ہوگا منظر یا نبی صلی اللہ علیہ وسلم
دیدہ و دل یا نبی اس کے منور ہو گئے
جس نے دیکھا آپ کا روئے منور یا نبی صلی اللہ علیہ وسلم
آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دم سے ملا ہے آدمیت کو وقار
آدمی ورنہ تھا اک مٹی کا پیکر یا نبی
یا نبی صلی اللہ علیہ وسلم جتنی محبت کی کسی نے آپ سے
اس قدر دل ہو گیا اس کا منور یا نبی صلی اللہ علیہ وسلم
آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دیدار سے ہوتے رہے جو فیضیاب
آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب تھے کیا خوش مقدر یا نبی
آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اصحاب سنتے ہوں گے اللہ کا کلام
آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہوں گے ساقی تسنیم و کوثر یا نبی
اک نگاہ لطف مجھ ناکارہ و ناچیز پہ
التجا ہے یہ میری بادیدہ تر یا نبی صلی اللہ علیہ وسلم
پلصراط و کوثر و میزان پہ بہر خدا
دھیان رکھئے گا امین کا روز محشر یا نبی صلی اللہ علیہ وسلم

(سید امین گیلانی)

تھا، جو کہ افغانستان کے ساتھ ملتا تھا۔ اور افغانستان میں مذہب شناس اور مذہب کے احترام کرنے والوں کی اکثریت اور حکومت تھی۔ نیز اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ یہاں پر مسلمان کٹر مذہبی اور کثیر تعداد میں موجود تھے۔ یہاں پر سکھوں کا راج تھا۔ سکھوں کی حکومت پشاور سے بھی آگے تک تھی۔ یہ سارا علاقہ پنجاب کہلاتا تھا۔ (۱۹۱۰ء میں سرحدی علاقہ کو پنجاب سے علیحدہ کر کے اس کا نام صوبہ سرحد رکھا گیا)۔ حضرت سید صاحبؒ کی یہ جنگ بظاہر سکھوں کے خلاف تھی مگر اصل میں اس خطہ کو حاصل کر کے انگریز کے خلاف مرکز بنانا تھا۔ یعنی سکھوں کی طاقت توڑ دی جائے اور اپنی طاقت بنا کر انگریز سے بھر پور جنگ کی جائے۔ مگر وہاں کے خوانین کی غداری نے کام دکھایا اور حضرت سید احمدؒ مع جماعت کے شہید کر دیئے گئے۔ اس معرکے میں اگرچہ حضرت سید احمد شہیدؒ اور ان کی جماعت کو ناکامی ہوئی مگر یہ ناکامی ہندوستان کے حریت پسند مسلمانوں میں آزادی کی آگ لگا گئی۔

یہ بات ذہن میں رہے کہ ان دنوں مسلمانوں کے علاوہ کسی دوسری قوم نے انگریز کے خلاف علم جہاد بلند نہیں کیا اس لیے کہ اقتدار مسلمانوں سے چھینا جا رہا تھا، ہندو یا سکھ قوم سے نہیں، اس لیے دوسری قوموں کو اس سے دلچسپی نہیں تھی۔

۱۰ مئی ۱۸۵۷ء کو اچانک یوپی کے شہر میرٹھ سے فوجوں نے بغاوت کر دی۔ جس کی وجہ سے پورے ہندوستان میں یہ جنگ پھیل گئی، اور اس کو جنگ آزادی کا نام دیا گیا۔ اور اس کا مرکز دہلی کو قرار دیا گیا۔ دہلی میں چونکہ مسلمانوں کی لنگڑی لولی بادشاہت قائم تھی، اسی کو اس کا سرپرست قرار دیا گیا۔ ہندوستان کے دوسرے صوبوں سے فوجیں دہلی پہنچنا شروع ہو گئیں۔ کولہا بارود کے مراکز لوٹ لیے گئے۔ حضرت سید احمد شہیدؒ کے علاقہ رائے بریلی سے فوج بغاوت کر کے جنرل بخت خان کی قیادت میں دہلی پہنچ گئی۔ پنجاب کی تمام فوجی دستے حضرت مولانا عبدالقادر لدھیانویؒ کی قیادت میں دہلی پہنچے۔ مولانا عبدالقادر لدھیانویؒ نے سب سے پہلا کام انگریز حکومت کے خلاف ''فتویٰ فرضیت جہاد'' کی تحریک شروع کی، اور جنرل بخت خان کی مدد سے جامع مسجد دہلی میں دہلی کے علماء کو بلا کر اس فتویٰ پر دستخط کرائے۔ (اس کی تفصیل مولانا محمد حسین بٹالوی کے رسالہ ''اشاعۃ السنۃ'' جلد پانچ میں موجود ہے) اس کے علاوہ مقامی طور پر بھی انگریزی حکومت کے خلاف جنگ شروع ہوگئی۔ نانوتہ میں حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، گنگوہ میں حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، شاملی میں حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ وغیرہ نے میدان جہاد کو آباد کیا۔ مگر یہ جنگ آزادی ناکام ہوگئی۔ اس لیے کہ اس دور میں بھی میر جعفروں اور میر صادقوں نے مخبریوں کے ذریعہ بھرپور کردار ادا کیا اور اپنی تجوریاں

مسلمانوں! ہوشیار رہو، اپنا ایمان بچاؤ

کچھ عرصہ سے معلوم ہوا ہے کہ مسلمانوں میں کچھ نا سمجھ افراد یورپی ممالک میں جا کر سیاسی پناہ حاصل کرنے کے لیے اپنے آپ کو قادیانی ظاہر کر کے وہاں کے محکموں میں بیان حلفی داخل کراتے ہیں۔ اس کے پیچھے قادیانی لابی متحرک ہے۔ اس پر ہمیں کئی دفع لوگوں نے سوالات بھیجے ہیں

(۱)۔ کیا ایسا شخص مسلمان رہ جاتا ہے؟

(۲)۔ کیا ایسے شخص کے ساتھ کسی مسلمان لڑکی کا نکاح کیا جا سکتا ہے؟

(۳) اگر ایسا شخص پہلے سے شادی شدہ ہے تو کیا اس کی بیوی اس کے نکاح میں رہی یا نہیں، وہ اب کیا کرے؟

(۴)۔ کیا ایسے شخص کی توبہ قبول ہو سکتی ہے، اگر ہو سکتی ہے تو اس کی کیا شکل ہے؟

جواب

(۱)۔ امت مسلمہ اور پاکستان اسمبلی کے متفقہ فیصلے کے مطابق قادیانی غیر مسلم اقلیت ہیں۔ ان پر وہی احکام لاگو ہوتے ہیں جو کہ دوسرے تمام غیر مسلم لوگوں پر ہوتے ہیں۔ لہذا اگر کوئی شخص جناب محمد ﷺ کی ختم نبوت کا اقرار کرتے ہوئے بھی اپنے آپ کو غیر کے سامنے قادیانی ظاہر کرتا ہے تو ایک طرح سے علی الاعلان وہ عقیدہ ختم نبوت کا منکر ہے، وہ شخص نہ صرف دائرہ اسلام سے خارج ہے بلکہ مرتد بھی ہے۔

(۲)۔ کسی بھی غیر مسلم اور خصوصاً مرتد کے ساتھ مسلمان عورت کا نکاح جائز نہیں۔

(۳) اگر کوئی شخص شادی کے بعد قادیانی ہو گیا تو اس کی بیوی کا نکاح بروئے شریعت باقی نہیں رہا۔ وہ عورت اس مرتد سے طلاق لیے بغیر عدت پوری کر کے دوسرے سے نکاح کر سکتی ہے۔

(۴) ایسے شخص کی توبہ عام طریقہ سے قبول نہیں۔ اس کی توبہ صرف اس شکل میں قبول ہو سکتی ہے کہ وہ اسی محکمہ میں جائے جس میں اس نے پہلے اپنے آپ کو قادیانی بنا کر پیش کیا تھا۔ یہ کہے کہ میں نے آپ کے محکمے سے یہ جھوٹ بولا تھا کہ میں قادیانی ہوں۔ اب میں وضاحت کرتا ہوں کہ میں قادیانی نہیں ہو۔ اس کے بعد وہ توبہ کرے۔ اس کے بغیر توبہ قبول نہیں۔ کیونکہ قادیانی ہر سال اسی قسم کے محکموں سے لوگوں کے قادیانی ہونے کی تصدیق کروا کر دنیا کو دھوکہ دینے کے لیے اپنی رپورٹ شائع کرتے ہیں کہ دیکھو اس سال اتنے لوگ قادیانی ہو گئے ہیں۔

منجانب۔ ابن انیس حبیب الرحمٰن لدھیانوی، فیصل آباد
مولانا حاجی اکرم شاد ، نیو یارک (امریکہ)

MONTHLY MAGAZINE **Millia** FAISALABAD PAKISTAN
JAMIA MILLIA ISLAMIA
Reg:M # FD-16

MOHALLAH KHALSA COLLEGE FAISALABAD Ph:041-8711569
E-mail: milliafsd@hotmail.com
Fax # 041-8724335

اعلان داخلہ

جامعہ ملیہ اسلامیہ (المسجلہ)

تاریخ داخلہ برائے طلباء 6 شوال

مندرجہ ذیل درجات میں داخلہ جاری ہے

درجہ رابعہ، درجہ ثالثہ، درجہ ثانیہ
درجہ اولیٰ، درجہ متوسطہ

میٹرک مع درجہ اولیٰ
درجہ حفظ

انگلش لینگویج، عربی لینگویج اور
کمپیوٹر کی تعلیم کا خاص اہتمام

وفاق المدارس کے نصاب کے ساتھ بی اے تک تعلیم کا انتظام

درجہ حفظ اور گردان میں طلباء کا داخلہ جاری ہے

داخلہ برائے طالبات

تاریخ داخلہ برائے طالبات ۹ شوال

شعبہ کتب کے تمام درجات (عامہ، خاصہ، عالیہ، عالمیہ) میں ہوگا
درجہ حفظ اور گردان میں طالبات کا داخلہ جاری ہے

نوٹ: داخلہ صرف شہری طالبات کا ہوگا

جامعہ کے شعبہ جات

برائے طلباء

درجہ کتب
وفاق المدارس کے نصاب کے ساتھ بی اے تک تعلیم

درجہ حفظ
4 سالہ نصاب میں حفظ کے ساتھ 8 تک تیاری

برائے طالبات

درجہ کتب
عامہ، خاصہ، عالیہ اور دورہ حدیث شریف

درجہ حفظ
4 سالہ نصاب میں حفظ کے ساتھ پرائمری تک تیاری

مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی مہتمم جامعہ ملیہ اسلامیہ
محلہ خالصہ کالج، فیصل آباد
041-8711569-03009657076